

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

اسلام اور قادیانیت

ڈاکٹر علامہ محمد سداقبال

صفحات : 116

ناشر : المُنْتَهِی پبلیکیشنز

ایڈیشن اول : جنوری تا جون 2024ء، جلد: 8، شمارہ: 26، 27

ملنے کے پتے:

* المُنْتَهِی پبلیکیشنز (چک امرورڈ) شگر گڑھ (0303-8517218)

* جامعہ رحمت قائد اعظم ٹاؤن صادق چوک ٹاؤن شپ لاہور (0302-3911531)

Regd. 2-66/8288

سہ ماہی
المُنْتَهِی
رجسٹرڈ

جلد 8 جنوری تا جون 2024ء، شمارہ 26، 27

سہ ماہی
مالی سبق اسلام شیخ طہ قیس شریعت اسلامیہ
خواجہ محمد عبد السلام جان زبیر
ہدایت دہلوی پروفیسر

مدیر اعلیٰ
خواجہ غلام دستگیر فاروقی

مدیر
ماہرہ مفتی غلام مرتضی ساقی

مفتی محمد اسد اللہ نوری

ڈاکٹر ممتاز احمد سیدی الازہری

ڈاکٹر محمد بلال شرفی القادری

محمد ثاقب رضا قادری

علامہ غلام مصطفی مجددی

پروفیسر علی وقار قادری

مجلس ادارت

مجلس مشاورت

علامہ محمد صغریٰ شاکر

قاری محمد مجید نوری

قاری نعیم احمد سلطانی

قانونی مشیر

رانا محمد شفیق ایڈووکیٹ

صابر علی قادری

حافظ علی رضا فیض، اکرام اللہ صدیقی

رابطہ کمیٹی

عمر علی قادری

قاری نور بنی نقشبندی

حافظ حماد ملک

0306-4373145
0342-5428102
0303-5238504

تہمتی شمارہ - 900/- روپے

راہیل احمد چشتی
0302-3911531

غلام دستگیر فاروقی نے منہاج القرآن پبلی کیشنز سے چھپوا کر آستانہ چشتیہ خیرہ شگر گڑھ سے شائع کیا۔

مرکزی آفس
المُنْتَهِی پبلیکیشنز (چک امرورڈ) شگر گڑھ

دہلی آفس
جامعہ رحمت ٹاؤن صادق چوک ٹاؤن شپ لاہور

E-mail: farooqi4156@hotmail.com

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
(۱)	پیش لفظ	۰۴
(۲)	قادیانیت اور راسخ الاعتقاد مسلمان	۰۶
(۳)	دی لائٹ وغیرہ کے جواب	۱۳
(۴)	اسٹینس مین کے نام ایک مکتوب	۱۸
(۵)	رومن حکومت کے تحت یہودی سالمیت	۲۱
(۶)	اسلام اور احمدیت	۲۴
(۷)	احمدیوں کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مکتوب	۵۰
(۸)	مسابقہ اربعین ختم نبوت 2023ء (رپورٹ)	۵۱
(۹)	”وفائے ختم نبوت تریقی نشست“ (رپورٹ)	۵۴
(۱۰)	سپریم کورٹ کا فیصلہ (اعلامیہ) (رپورٹ)	۵۵

پیش لفظ

(مدیر اعلیٰ)

عقیدہ ختم نبوت دین اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ اس عقیدہ کی حفاظت کیلئے قرآن و سنت نے توحید کے بعد بہت زور دیا ہے۔ اوائل اسلام سے لے کر اب تک امت اجابت کے ہر ذمہ دار فرد نے اس عقیدہ کا پہرہ دیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند نے جہاں بلند پایہ بہت سی شخصیات کو جنم دیا ہے انہی چند افراد میں فرد فرید حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبال علیہ الرحمۃ کا نام ہے جن کی خدمات ملک و ملت کیلئے ناقابل فراموش اور انمٹ ہیں۔ مزید برآں اہل حق قافلہ تحفظ ختم نبوت کی خوش نصیب ہستیوں میں ایک خوش نصیب نام حضرت اقبال کا ہے۔ جنہوں نے مفکرانہ، مدبرانہ اور فلسفیانہ اسلوب کے ساتھ فتنہ قادیانیت کا پردہ چاک کیا۔ ان کی اپنی تحاریر میں روشنی میں فتنہ قادیانیت کے نمودار ہونے کے بعد کچھ وقت ہمیں علامہ کی شخصیت میں ایسا ملتا ہے جہاں ان کا فکری رجحان مرزا غلام احمد قادیانی کے بنائے باطل نظام کی طرف رہا بعد ازاں دیگر عوامل کے ساتھ پروفیسر محمد الیاس برنی کہ شہرہ آفاق تصنیف ”قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ“ نے ہمیز کا کام کیا اور علامہ مکمل طور پر فتنہ قادیانیت کے خلاف اپنی خداداد صلاحیتوں کو صرف کرنے لگے جن پر ان کا اردو، فارسی کلام شاہد و عادل ہے۔

ہم نے اپنی کاوش ”اولیات ختم نبوت“ میں ”قادیانیت کو اقلیتی فرقہ قرار دینے کے مطالبہ میں اولیت اقبال اور رد قادیانیت پر اولین انگریزی خطبات و مقالات“ چند چیزیں حضرت اقبال سے متعلق اس بابت جمع کی ہیں۔

رد قادیانیت پر اقبال کے تاریخی خطوط پہلے بھی مختلف کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں لیکن ہماری خواہش تھی کہ اقبال پر کچھ کام ہمارے پلیٹ فارم سے ہو تو محققین کی مشاورت سے حضرت اقبال کی حیات میں شائع شدہ خطبات کو منتخب کیا گیا۔ ماہر اقبالیات پروفیسر ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

(۱)

قادیانیت اور راسخ الاعتقاد مسلمان

قادیانیوں اور راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے درمیان جو تنازع شروع ہوا ہے وہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ ہندی مسلمانوں نے حال ہی میں اس اہمیت کو محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ میں انگریزوں کے نام ایک کھلا خط لکھوں جس میں اس تنازع کے معاشرتی اور سیاسی مضمرات کی وضاحت کی جائے لیکن بد قسمتی سے میری صحت نے مجھے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ تاہم فی الوقت ایسے معاملے پر چند لفظ کہنے میں مسرت محسوس کرتا ہوں جو میرے خیال میں ہند کے مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ میں ابتداء میں ہی اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی دینیاتی استدلال میں پڑنا نہیں چاہتا نہ ہی میں تحریک قادیانیت کے بانی کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ اول الذکر میں ان لوگوں کو کوئی دلچسپی نہ ہوگی جن کے لیے یہ بیان ترتیب دیا جا رہا ہے۔ مؤخر الذکر کے لیے ابھی ہند میں وقت نہیں آیا۔ میرا نقطہ نظر عام تاریخ اور تقابلی مذہب کے ایک طالب علم کا سا ہے۔

ہند بہت سے مذاہب سے متعلق فرقوں کی سرزمین ہے اور اسلام ایک مذہبی فرقہ ہے نسبتاً عمیق تر اعتبار سے ان فرقوں کے مقابلے میں جن کے ڈھانچے کا تعین ہوتا ہے کچھ مذاہب کے نقطہ نظر سے اور کچھ تخیل نسل کی بنیاد پر۔ اسلام نسل کے تخیل کو کلیتاً مسترد کرتا ہے اور اپنی اساس صرف مذاہب پر استوار کرتا ہے۔ چونکہ اسلام خود کو صرف مذاہب پر مبنی تصور کرتا ہے، ایک ایسی بنیاد جو تمام تر روحانی ہے اور نتیجتاً خونی رشتوں سے زیادہ ملکوتی ہے، مسلم معاشرہ قدرتی طور پر ان قوتوں کے خلاف زیادہ حساس ہے جنہیں وہ اپنی سالمیت کے لیے ضرر رساں سمجھتا ہے۔ کوئی مذہبی معاشرہ جو تاریخی اعتبار سے اسلام کے بطن سے جنم لیتا ہے، جو اپنی بنا کے طور پر ایک نئی رسالت، پیغمبری کا مدعی ہے اور ان تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتا ہے جو اس کی مبینہ وجوہ کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ لہذا ہر مسلمان کو اسے اسلام کی یک جہتی کے لیے ایک سنگین خطرہ تصور

(ڈائریکٹر اقبال اکادمی لاہور) نے ہماری عرضی کو قبولیت بخشی اور ہماری رسائی اقبال کی حیات میں شائع شدہ مکتوبات تک ہوئی۔ برادر محمد ثاقب رضا قادری (انجیر ریسرچ فورم لاہور) نے نظر ثانی کی، اس طرح یہ ذخیرہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ان احباب کی توجہ ضروری چاہتے ہیں جو ان سب حقائق کے باوجود اقبال ابھی تک عقیدہ ختم نبوت کے حوالہ سے اُن کو قادیانی ثابت کرنے پر اپنی صلاحیتوں کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ کام تو قادیانیوں کا ہے۔ آپ کی بڑی تحقیق ہوگی لیکن خدا ار اپنی تحقیق کا دھارا موڑے اور نت نئے فتنوں سے متعلق شائستہ زبان، علمی میدان میں اُمت کو آگاہی کا فریضہ ادا کیجئے۔

کرنا چاہیے۔ یہ لازمًا اس لیے ہونا چاہیے چونکہ مسلم معاشرے کی سالمیت کا سارا تصور ختم رسالت کے نظریے سے اخذ کیا گیا ہے۔

ختم المرسلین کا نظریہ بنی نوع انسان کی ثقافتی تاریخ میں اغلباً بے حد اصلی (طبعی) تصور ہے۔ اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مغرب اور وسطی ایشیا میں ماقبل اسلام مجوسی ثقافت کا بکمال احتیاط مطالعہ کرتے ہیں۔ جدید تحقیق کی رو سے مجوسی ثقافت زرتشتی، یہودی، یہودیانہ عیسائیت، کلدانی اور سبتی مذاہب پر محیط ہے۔ ان نظریاتی فرقوں کے لیے تسلسل رسالت کا نظریہ لازمی تھا۔ نتیجتاً یہ لوگ بعد ازاں مسلسل توقع کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہ بھی عین اغلب ہے کہ یہ مجوسی وغیرہ نفسیاتی طور پر اس امید اور توقع کی زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہوں۔ جدید انسان پرانے زمانے کے مجوسیوں کے مقابلے میں روحانیت سے زیادہ بے نیاز ہوتا ہے۔ مجوسی رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرانے فرقے درہم برہم ہو گئے اور ہر قسم کے مذہبی طالع آزمائوں کے ذریعہ سے نئے نئے فرقے معرض وجود میں آتے گئے۔ جدید علام اسلام میں جاہ طلب اور نیم جاہل ملائیت نے جدید طباعتی سہولتوں کا نارا و فائدہ اٹھایا اور نہایت بے حیائی سے ماقبل اسلام قدیم مجوسی نظریات کو بیسویں صدی کے علی الرغم مسلط کرنے کی کوشش کی۔ یہ بدیہی بات ہے کہ اسلام جو دنیا کے مختلف فرقوں کے بہت سے اوردانوں کو ایک ہی تسبیح میں پرو دینے کا دعویدار ہے ایسی تحریک کو کس طرح قبول کر سکتا تھا جو اس کی اپنی سالمیت کے لیے خطرہ ہو اور انسانی معاشرے کو مزید تقسیم کر دینے کا وعدہ کرتی ہو۔

ماقبل اسلام مجموعیت کے جدید احیاء کی دو شکلوں (بہائیت اور قادیانیت) میں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہائیت، قادیانیت کے مقابلے کہیں زیادہ دیانت پر مبنی ہے۔ کیونکہ اول الذکر علی الاعلان اسلام سے علیحدگی اختیار کرتی ہے جبکہ مؤخر الذکر اسلام کے بعض زیادہ اہم خارجی شواہد سے چھٹی رہتی ہے در آنحالیکہ اس کا باطن اسلام کی روح اور اس کی تمناؤں کے سراسر خلاف اور دشمنی سے مملو ہے۔ اس کے ہاں خدا کا تصور جس کی تحویل میں اپنے مخالفوں کے لیے زلزلوں اور طاعون کے غیر مختتم ذخیرے موجود ہیں یہودیت کے عنصر کا حامل ہے کہ آسانی سے اس تحریک کو قدیم یہودیت کی جانب مراجعت کرنے والی تحریک سمجھا جاسکتا ہے۔ روح مسیح کے تسلسل کا تصور

زیادہ تر یہودی تصوف سے متعلق ہے بمقابلہ مثبت یہودیت کے۔ پروفیسر بورجنھوں نے پولینڈ کے مسیح بائیسیم کا تذکرہ ہم تک پہنچایا ہے کہتے ہیں ”یہ خیال کیا جاتا تھا روح مسیح پیغمبروں کے توسل سے زمین پر اتری اور مقدس لوگوں کی ایک طویل صف جس کی طنابیں موجودہ زمانے تک کھینچی ہوئی ہیں۔ ماقبل اسلام مجوسی ملحدانہ تحریکوں کے زیر اثر ”بروز“ ”حلول“ اور ”قل“ جیسے الفاظ ایجاد کیے گئے تاکہ پیہم تخلیق مسیح کے عمل کی توثیق ہوتی رہے۔ یہ بھی از بس ضروری تھا کہ مجوسی نظریے کی توضیح کی عرض سے نئی نئی اصطلاحات وضع کی جائیں تاکہ مسلم ضمیر کے لیے کم سے کم برہم کن ثابت ہوں۔ مسیح موعود کی اصطلاح بھی مسلم دینی شعور کی تخلیق نہیں ہے۔ یہ ایک ناجائز اظہار ہے جس کی ابتدا ماقبل اسلام مجوسی نظریے کی رہین منت ہے۔ ہمیں یہ (اصطلاح) ابتدائی اسلامی دینی اور تاریخی ادب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اس قابل ذکر حقیقت کا انکشاف بھی پروفیسر دین سنک کی کتاب ”احادیث رسول اکرم (ﷺ) میں مطابقت“ سے ہوا جو احادیث کے گیارہ مجموعوں اور اسلام کے تین ابتدائی ترین تاریخی دستاویزات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آجائے والی بات ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اس اصطلاح کو کیوں کبھی بھی استعمال نہ کیا۔ یہ اصطلاح انھیں اس لیے اچھی نہ لگی کہ اس میں تاریخی عمل کا ایک غلط تصور پنہاں تھا۔ مجوسی ذہن زماں کو ایک گول دائرے میں حرکت پر قیاس کرتا تھا۔ بحیثیت ایک پیہم تخلیقی عمل کے تاریخی عمل کی درست وضاحت کرنے کا سہرا تو اسلامی مفکر اور مورخ ابن خلدون کے سر بندھا تھا۔

لہذا قادیانی تحریک کی مخالفت میں ہندی مسلمانوں کے جذبات کی یہ شدت جاری عمرانیات کے طالب علم کے لیے بالکل قابل فہم ہوگی۔ اوسط درجہ کا مسلمان جس کے بارے میں سول اینڈ میٹری گزٹ میں ایک لکھنے والے نے کہا کہ اس کے اعصاب پہ ملا ہے سوار، کی اس تحریک کی مخالفت میں سرگرم عمل ہونے کی وجہ زیادہ تر اپنی حفاظت کی حس تھی بجائے اپنے عقیدے میں تصور ختم نبوت کے مکمل تر مفہوم کے ادراک کے۔ نام نہاد روشن خیال مسلمانوں نے اسلام میں ختم المرسلین کے نظریے کو سمجھنے کی شاذ و نادر ہی کوئی کوشش کی ہوگی اور مغربی ثقافت کی غیر محسوس یلغار نے اسے اپنی حفاظت کی حس سے بھی مزید محروم کر دیا۔ ان میں سے بعض روشن

خیال مسلمان تو اس حد تک چلے گئے کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کو رواداری کی تبلیغ کرنے لگے۔ میں سر ہرٹ ایمرسن (گورنر پنجاب) کو مسلمانوں کو رواداری کا سبق دینے پر تو بآسانی معاف کر سکتا ہوں کہ وہ تو ایک جدید یورپین ٹھہرے جو کلیتاً ایک مختلف تہذیب و تمدن میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اور شاید خود میں وہ بصیرت پروان نہ چڑھا سکے جو کسی کے لیے بھی ایک مختلف ثقافت میں ایسے مسئلے کو سمجھنے کا فہم عطا کر سکے جو اس کے ڈھانچے کے تحفظ کے لیے از بس ضروری ہے۔

ہند میں حالات کہیں زیادہ منفرد نوعیت کے ہیں۔ مذہبی فرقوں کے اس ملک میں جہاں ہر فرقے کے مستقبل کا انحصار اس کی سالمیت پر ہے مغربی قوم کے لوگ حکمران ہیں جو مذہب میں عدم مداخلت کے سوا اور کوئی حکمت عملی اختیار نہیں کر سکتے۔ ہند جیسے ملک میں اس آزاد اور ناگزیر حکمت عملی کے تکلیف دہ نتائج برآمد ہوئے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ بات کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا کہ ہند میں برطانوی حکومت کے تحت مسلم فرقے کی سالمیت اس سے کم تر درجے پر ہے جتنی رومن حکومت کے تحت حضرت یسوع مسیح کے زمانے میں یہودی فرقے کو حاصل تھی۔ ہند میں کوئی بھی مذہبی طالع آزما کوئی بھی دعویٰ کر سکتا ہے اور اختصار کی خاطر نیا فرقہ تشکیل دے سکتا ہے۔ ہماری اس آزاد حکومت کو اصل فرقے کی سالمیت کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں بشرطیکہ طالع آزما اسے اپنی وفاداری کا یقین دلا دے اور اس کے پیروکار سرکاری محاصل باقاعدگی سے ادا کرتے ہوں۔ اسلام کے بارے میں اس حکمت عملی کو ہمارے عظیم شاعر اکبر الہ آبادی نے صحیح تناظر میں دیکھا جو اپنے معمول کے مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ

انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

میں راسخ العقیدہ ہندوؤں کے اس مطالبے کو بہت سراہتا ہوں کہ نئے دستور میں مذہبی مصلحین کے خلاف تحفظ کا اہتمام کیا جائے۔ درحقیقت یہ مطالبہ سب سے پہلے مسلمانوں کی طرف سے ہونا چاہیے تھا جو ہندوؤں کے برعکس اپنے ڈھانچے سے نسل کے تصور کو کلیتاً مسترد کرتے ہیں۔ حکومت کو موجودہ صورت حال پر نہایت متانت کے ساتھ غور کرنا چاہیے اور اگر ممکن ہو تو یہ

کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ایک اوسط درجے کے مسلمان کی ذہنیت کو سمجھے جو اس ضمن میں اپنے فرقے کی سالمیت کے لیے اسے بے حد اہم گردانتا ہے۔ بہر کیف اگر کسی فرقے کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو جائے تو اس فرقے کے سامنے جو واحد راستہ رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ انتشار کی قوتوں کے خلاف اپنا دفاع کرے۔ اور اپنے تحفظ کے کیا طریقے ہیں؟

متنازع فیہ تحریریں، اور اس شخص کے دعویٰ کی تردید جسے موجودہ فرقہ ایک مذہبی طالع آزما گردانتا ہے۔ ان حالات میں کیا موجودہ فرقے کو رواداری کا درس دینا مناسب ہے جس کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو اور باغی گروہ کو اپنا پروپاگنڈا کرنے کی اجازت دینا بالخصوص جب کہ پروپاگنڈا گالیوں سے پر ہو؟

اگر ایک گروہ، جس نے اصل فرقے کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا ہو، اگر حکومت کے لیے کچھ خاص خدمات پیش کر رہا ہو تو مؤخر الذکر کو ان خدمات کا جتنا وہ چاہے معاوضہ ادا کرنے کی آزادی حاصل ہے اور دیگر فرقوں کو اس کا مطلق ملال نہ ہو گا۔ لیکن یہ توقع کرنا تو بہت ہی بڑی زیادتی ہو گی کہ اصل فرقہ خاموشی کے ساتھ ان قوتوں کو نظر انداز کرتا رہے جو سنگین طریقے سے اس کی اجتماعی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے درپے ہوں۔ اجتماعی زندگی بھی خطر تھلیل سے اسی طرح متاثر ہوتی ہے جس طرح انفرادی زندگی۔ اس بارے میں اس امر کے اضافے کی حاجت نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان باہمی دینیاتی بحث و بحثی سے اہم اصول متاثر نہیں ہوتے کہ ان اختلافات کا تعلق تفصیلات سے ہے ایک دوسرے پر الزام دھرنے کے باوصف۔

ایک نکتہ اور ہے جو حکومت کے خصوصی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہند میں مذہبی طالع آزماؤں کی جدید آزادی کی بنیاد پر حوصلہ افزائی سے لوگ مذہب سے زیادہ سے زیادہ بے گانہ ہوتے جائیں گے اور اس طرح ہند کے فرقوں کی زندگی سے آخر کار مذہب کا اہم عنصر بالکل معدوم ہو جائے گا۔ ہندی ذہن پھر مذہب کا کوئی اور نعم البدل تلاش کرے گا جو ملحدانہ مادیت پرستی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جو روس میں ظاہر ہو چکی ہے۔

مگر مذہبی مسئلہ ہی وہ واحد مسئلہ نہیں ہے جو اس وقت مسلمانان پنجاب کے ذہنوں میں خلفشار پیدا کر رہا ہے۔ سیاسی نوعیت کے کچھ اور جھگڑے بھی ہیں جن کی جانب سر ہرٹ ایمرسن

ہیں۔ کوئی اور حکمت عملی ممکن ہی نہیں۔ تاہم میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میرے خیال میں یہ حکمت عملی مذہبی فرقوں کے مفادات کے لیے ضرر رساں ہے لیکن اس سے فرار کی کوئی راہ نہیں۔ جن پر اس کی زد پڑتی ہے انہیں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے مناسب ذرائع استعمال کرنا ہوں گے۔ میری رائے میں ہند کے حکمرانوں کے لیے بہترین طریقہ کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک علیحدہ فرقہ قرار دے دیں۔ یہ قادیانیوں کی اپنی حکمت عملی سے بھی مطابقت رکھے گا اور ہندی مسلمان انہیں ایسے ہی گوارا کر لے گا جیسے وہ دیگر مذاہب کو برداشت کرتا ہے۔

نے میری دانست میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اشارے کیے۔ بلاشبہ ان کی نوعیت خالصتاً سیاسی ہے۔ لیکن یہ بھی اسی طرح مسلمانان پنجاب کے اتحاد کو اسی سنگینی کے ساتھ متاثر کرتے ہیں جس طرح مذہبی مسئلہ کرتا ہے۔ مسلمانان پنجاب کے اتحاد کے ضمن میں حکومت پنجاب کے اضطراب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں اس سے یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ ذرا سا اپنے گریبان میں بھی جھانک لیجیے۔ میں پوچھتا ہوں، دیہی اور شہری مسلمانوں میں تمیز قائم کرنے کا کون ذمہ دار ہے۔ یہ ایسی تمیز ہے جس سے مسلم فرقہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا اور دیہی گروہ متعدد ذیلی گروہوں میں بٹ گئے جو ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ برسر پیکار رہتے ہیں؟

سر ہر برٹ ایمرن مسلمانان پنجاب میں مناسب قیادت کے فقدان کا دکھڑا روتے ہیں لیکن کاش وہ یہ محسوس کرتے کہ حکومت نے جس دیہی اور شہری تمیز کو جنم دیا ہے اور جسے جاہ پرست سیاسی طالع آزمائوں کے توسل سے برقرار رکھا ہوا ہے جن کی نظریں اپنے ذاتی مفادات پر لگی رہتی ہیں پنجاب میں اتحاد اسلام کی بجائے اس (بیماری) نے فرقے کو پہلے ہی حقیقی رہنما پیدا کرنے کے نااہل بنا دیا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترکیب اس خواہش کا ماحصل ہے کہ اصلی قیادت کے ابھرنے کو ناممکن بنا دیا جائے۔ سر ہر برٹ ایمرن تو مسلمانوں میں قیادت کے فقدان پر اظہار تاسف کرتے ہیں اور میں حکومت کی طرف سے ایسے نظام کو جاری و ساری رکھنے پر افسوس ظاہر کرتا ہوں جس نے صوبے میں صحیح قیادت کے ابھرنے کی جملہ امیدوں کا خون کر دیا ہے۔

عبارت مابعد

میں سمجھتا ہوں کہ اس بیان سے بعض حلقوں میں کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ میں نے نہایت لطیف انداز میں حکومت کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ طاقت کے بل پر قادیانی تحریک کو کچل دے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے یہ بات واضح کی ہے کہ مذہب میں عدم مداخلت کی حکمت عملی وہ واحد حکمت عملی ہے جسے ہند کے فرمانروا اختیار کر سکتے

(۲)

دی لائٹ وغیرہ کے جواب

(متذکرہ بالا بیان پر تنقید کرتے ہوئے ایک قادیانی ہفت روزہ لائٹ نے لکھا ”دیگر عظیم مفکروں کی طرح وہ (ڈاکٹر اقبال) بھی اس بات کے قائل نہیں کہ وحی یا الہام کے ذریعہ انسان کی خدا سے لفظاً گفتگو ہو“ جب ایک اخباری نمائندے نے اس الزام کے بارے میں ڈاکٹر اقبال سے ملاقات کی تو انھوں نے کہا):

لائٹ نے اپنی اس الزام کی بنا ایک اردو شعر پر استوار کی ہے:

ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل
خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں

یہ سیدھی سادی اردو ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی روحانی زندگی میں زبانی ہم کلامی سے بھی اعلیٰ و ارفع مرحلہ ہے۔ لیکن اس شعر کا دینیاتی نظریے کے وحی یا الہام کے تصور سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے لیے میں لائٹ کی توجہ اپنے خطبات (انگریزی متن مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۴ء) کی جانب مبذول کرواؤں گا جس میں میں نے صفحہ ۲۱ پر لکھا ہے:

”لہذا یوں وہ قدیم نزاع بھی جس کا تعلق وحی باللفظ سے ہے اور جس نے ایک زمانے میں الیسین اسلام کو طرح طرح کی مشکلات میں ڈال رکھا تھا حل ہو جاتا ہے۔ غیر واضح احساس کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنا اظہار فکر کے پیرائے میں کرے، رہا فکر تو وہ خود اپنے وجود سے اپنا مرئی بیکر تلاش کر لیتا ہے لہذا یہ کہنا کوئی استعارہ نہیں کہ فکر اور لفظ بیک وقت احساس کے بطن سے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ منطقی فہم ان کی زمانی ترتیب کو دیکھتا ہے اور یوں انھیں ایک دوسرے سے الگ ٹھہراتے ہوئے اپنے لیے طرح طرح کی مشکلات پیدا کر لیتا ہے۔ بہر حال ایک لحاظ سے الفاظ بھی وحی ہوتے ہیں“

(جب ان سے اس حدیث کے بارے میں استفسار کیا گیا جس کا لائٹ نے حوالہ دیا کہ ہر

صدی کے آغاز پر مجدد مودار ہوتے ہیں تو ڈاکٹر اقبال نے جواب دیا)۔
”مدیر لائٹ نے ایسی حدیث کا حوالہ دیا جو ریاضیاتی اعتبار سے ایک تاریخی عمل کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کرتی ہے جب کہ میں ایک شخص کی روحانی قوت کا قائل ہوں اور اس بات کا بھی کہ روحانیت سے سرشار انسانوں کی پیدائش کا امکان بھی ہے۔ مجھے اس کا یقین نہیں کہ تاریخی عمل ریاضیاتی اعتبار سے اس قدر ٹھیک ٹھیک ہوتا ہے جیسا کہ (مدیر) لائٹ سمجھتے ہیں۔ ہم بہ آسانی اس امر کا اعتراف کر سکتے ہیں کہ تاریخی عمل کی نوعیت کو سمجھ لینا ہمارے فہم و ادراک سے ماورائی ہے۔ منفی انداز میں میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ مجھے ایسا نہیں لگتا کہ یہ ریاضیاتی طور سے اتنا ٹھیک ٹھیک ہو سکتا جیسا کہ لائٹ خیال کرتا ہے۔ میں خود کو ابن خلدون کی اس رائے سے اتفاق کرنے پر زیادہ راغب پاتا ہوں کہ تاریخی عمل ایک آزاد تخلیقی تحریک ہوتی ہے اور ایسا عمل نہیں ہوتا جس کی راہ اور رنگ ہائے میل پہلے سے متعین کیے جاسکے ہوں۔ جدید زمانے میں اس رائے کا اظہار برگساں نے ابن خلدون کے مقابلے میں زیادہ وضاحت اور سائنسی صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لائٹ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے اسے غالباً جلال الدین سیوطی نے ذاتی مفاد میں عام کیا تھا اور اسے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ اس کا ان دو کتابوں صحیح بخاری اور مسلم میں بھی کوئی ذکر نہیں جنھیں بہت زیادہ مستند تصور کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض روحانی شخصیتوں کا تاریخی عمل کی نوعیت کا رویا ہو لیکن افراد کے ذاتی رویا تو منطقی استدلال کی اساس نہیں بن سکتے۔ یہ ایسا ضابطہ ہے جسے ماہرین احادیث نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔“

(جب ان سے دریافت کیا گیا کہ انھوں نے سن رائز میں شائع شدہ وہ مکتوب دیکھا ہے جس میں مکتوب نگار نے ان کے ایک لیکچر کا حوالہ دیا اور ان پر تضاد بیانی کا الزام لگایا ہے تو ڈاکٹر اقبال نے جواب دیا)۔ ”جی ہاں“۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس محمولہ بالا لیکچر کی کوئی نقل موجود نہیں نہ اصل انگریزی میں اور نہ ہی اس کے اردو ترجمے میں جو مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ لیکچر ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل دیا گیا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کر لینے میں کوئی پس و پیش نہیں ہو سکتا کہ ربع صدی قبل مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی توقعات تھیں۔ اس سے قبل بھی ممتاز فاضل مسلم مصنف مولوی چراغ علی (اسلام پر متعدد کتابوں کے مصنف) نے بانی تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ برائین احمدیہ نامی کتاب میں بیش قیمت اضافے کیے لیکن کسی بھی مذہبی تحریک کے حقیقی مشمولات اور اس کی اصل غرض و

غایت ایک دن میں تو منکشف نہیں ہو جاتیں۔ ان کے منصفہ شہود پر آنے میں قرن ہا قرن لگتے ہیں۔ تحریک کے دو حلقوں کے مابین اندرونی جھگڑوں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ جن لوگوں کا بانی تحریک سے ذاتی ربط تھا انھیں بھی تحریک کے مالمہ و ماملیہ کے بارے میں کما حقہ علم نہیں تھا اور یہ معلوم نہیں تھا کہ آگے چل کر تحریک کیا رخ اختیار کرے گی۔ ذاتی طور پر میرے لیے تحریک اس وقت مشتبہ ہو گئی جب قطعی طور سے ایک نئی رسالت کا دعویٰ کیا گیا جو بانی اسلام کی رسالت سے بھی اعلیٰ و ارفع تھی اور باقی عالم اسلام کو کافر قرار دے دیا گیا۔ بعد ازاں جب میں نے اپنے کانوں سے تحریک کے ایک رکن کو رسول اکرم ﷺ کے بارے میں سو فیاض زبان استعمال کرتے سنا تو میرے شبہات بغاوت میں تبدیل ہو گئے۔ آپ انھیں ان کی جڑوں کے حوالے سے نہیں جانیں گے بلکہ انھیں پہچانیں گے ان کے ثمرات کے حوالے سے۔ اگر میرا اس وقت کا رویہ میری اپنی تردید کرتا ہے تو یہ تو ایک زندگی اور غور و فکر کرنے والے شخص کا شرف ہے کہ وہ اپنی تردید آپ کر دے۔ جیسا کہ ایمرسن نے کہا صرف پتھر اپنے آپ کی تردید نہیں کرتے۔“

(جب ان سے دریافت کیا گیا کہ رسول اکرم ﷺ کے بعد کیا فیضان الہی کا امکان باقی ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ فیضان الہی سے مملو مصلحین تشریف لائیں تو ڈاکٹر اقبال نے جواب دیا)۔

”میرے لیے آپ کے اس سوال کا جواب دینا اس طرح زیادہ مناسب ہو گا کہ میں آپ کی توجہ اپنے خطبات کی جانب مبذول کر دوں جن میں صفحہ ۲۱-۲۰ پر میں نے لکھا:

نظریہ خاتمیت سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اب عقل نے جذبات کو زندگی سے بالکل بے دخل کر دیا۔ ایسی بات نہ ممکن ہے اور نہ پندیدہ۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ باطنی واردات کی خواہ کوئی بھی شکل کیوں نہ ہو یہ ہمیں یہ حق عطا کرتا ہے کہ ہم ایک آزاد تنقیدی رویہ اور یہ عقیدہ اپنائیں کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق حاصل نہیں ہے کہ اس کے علم کا سرچشمہ مافوق الفطرت ہے اور یہ کہ اس نوعیت کے دعویٰ کا حق بنی نوع انسان کی تاریخ سے ختم ہو چکا ہے۔ اس نوع کا عقیدہ دراصل ایک نفسیاتی قوت ہے جو اس طرح کے استحقاق کو پینپنے سے روکتا ہے۔ اس تصور کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کی باطنی واردات کی دنیا میں علم کے نت نئے راستوں کے دروا کر دے۔ عین جس طرح کلمہ اسلام کے پہلے نصت جزو نے انسان کو یہ نظر بخشی کہ وہ خارج سے

متعلق اپنے محسوسات اور تجربات کا مطالعہ تنقیدی نقطہ سے کرے اور مظاہر فطرت کو الوہیت کا رنگ دینے سے احتراز کرے جیسا کہ قدیم تہذیبوں کا طریقہ کار تھا۔ لہذا مسلمانوں کو چاہیے کہ صوفیانہ واردات کو خواہ اس کی نوعیت کیسی بھی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو بالکل قدرتی واردات تصور کریں اور ان پر اسی طرح تنقیدی نظر ڈالیں جیسا کہ وہ انسانی تجربات کے دیگر پہلوؤں پر ڈالتے ہیں۔ یہ خود رسول اکرم ﷺ کے اپنے رویے سے بھی ظاہر ہے جو انھوں نے ابن صیاد کے نفسیاتی تجربے کے ضمن میں اختیار فرمایا تھا۔ اسلام میں دراصل تصوف کا مقصد باطنی واردات کو باقاعدگی کی شکل دینا تھا اگرچہ اس امر کا اعتراف ہونا چاہیے کہ یہ صرف ابن خلدون واحد مسلمان تھے جنھوں نے اس موضوع پر خالصتاً علمی انداز میں کوشش کی۔

ابتدائی جملے سے یہ واضح طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ نفسیاتی اعتبار سے خدا رسیدہ بزرگ، (ولی اللہ) یا وحی الہی کردار کے لوگ ہمیشہ دنیا میں پیدا ہوتے رہیں گے۔ آیامز اصاحب کا تعلق اس قبیلے کے لوگوں سے تھا یا نہیں یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔ درحقیقت جب تک بنی نوع انسان کی روحانی قوت ساتھ دیتی ہے انسان کو زندگی کے بہت آدرش سکھانے کے لیے جملہ اقوام و ملل میں اس طرح کے لوگ نمودار ہوتے رہیں گے۔ اس کے برعکس سوچنا انسانی تجربے کا منہ چڑانے کے مترادف ہو گا۔ فرق صرف اتنا سا ہے کہ جدید انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے صوفیانہ تجربات کا تنقیدی جائزہ لے لے۔ دیگر امور کے علاوہ ختم نبوت کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی زندگی میں جملہ ذاتی اختیارات ختم ہو چکے ہیں جن کے انکار سے انسان مردود و ملعون ٹھہرے۔“

(جب ان سے پارسی مسٹر ڈنشا کے مکتوب مطبوعہ اسٹینٹس مین کے بارے میں دریافت کیا گیا تو ڈاکٹر اقبال نے کہا)۔ ”مجھے اس ضمن میں کچھ نہیں کہنا ماسوا اس کے کہ میں ان سے پوری طرح سے متفق ہوں جہاں تک ان کے بڑے نظریے کا تعلق ہے کہ تاریخ اسلام کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کے ضمن میں فارسی عناصر نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ فارسی اثر اس درجہ وسیع ہے کہ اسلام پر مجوسیت کی پٹری دیکھ کر اسپینگلر تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ اسلام بھی ایک مجوسی دین ہے۔ اپنے خطبات میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اسلام پر سے مجوسیت کی ان پٹریوں کو یکسر اتار پھینکوں اور مجھے امید ہے کہ میں اپنی (کتاب) تعارف مطالعہ قرآن کریم

(۳)

اسٹینڈس مین کے نام ایک مکتوب

(روزنامہ اسٹینڈس مین نے قادیانیت اور راسخ الاعتقاد مسلمان، ڈاکٹر اقبال کا بیان شائع کیا اور اس کے ساتھ ہی پہلے ادارے میں اس پر تنقید شائع کی۔ حسب ذیل مکتوب اس تنقید کے جواب میں لکھا گیا جو اسٹینڈس مین نے اپنی ۱۰ جون ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں شائع کیا)۔

میں آپ کے تنقیدی ادارے کے لیے آپ کا بہت شکر گزار ہوں جو ۱۴ مئی کی اشاعت میں شائع ہوا۔ آپ نے اپنے ادارے میں جو سوال اٹھایا ہے وہ بہت اہم ہے اور مجھے حقیقتاً مسرت ہے کہ آپ نے یہ سوال اٹھایا۔ میں نے اپنے بیان میں اس سوال کو اس لیے نہیں اٹھایا تھا کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ جب سے اس خیال نے جنم لیا ہے کہ متبادل نبوت کی بنیاد پر ایک نئے فرقے کی تعمیر ہونی چاہیے قادیانی مسلسل مذہبی اور معاشرتی امور میں علیحدگی پسند حکمت عملی پر کار بند ہیں اور اس تحریک کے خلاف مسلمانوں کے جذبات میں شدت کے پیش نظر خود حکومت کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں میں اتنے بڑے بنیادی فرق کو محسوس کرے اور مسلمانان ہند کی جانب سے ایک رسمی عرضداشت کا انتظار کیے بغیر اس معاملے میں انتظامی مداخلت کرے۔ اس ضمن میں حکومت کے سکھ فرقے کے بارے میں رویے سے کہ ۱۹۱۱ء تک انتظامی طور سے انھیں ایک علیحدہ سیاسی وحدت تصور نہیں کیا جاتا تھا اور بعد ازاں اسے سمجھا جانے لگا، بغیر سکھوں کی جانب سے کسی رسمی عرضداشت اور لاہور ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے علی الرغم کہ سکھ ہندو ہیں میرے احساسات کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

تاہم اب جب کہ آپ نے یہ سوال اٹھا ہی دیا ہے تو اس معاملے کے بارے میں چند خیالات پیش کر دوں جنہیں میں برطانوی اور مسلم دونوں نقطہ ہائے نگاہ سے اعلیٰ ترین اہمیت کا حامل سمجھتا ہوں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں اس کی بالکل وضاحت کر دوں کہ میں کیا، کب اور کہاں کسی ایک فرقے کے مذہبی اختلافات کے بارے میں حکومت کی مداخلت کو برداشت کر سکتا

میں اس ضمن میں مزید کام کر سکوں گا۔ مجوسی فکر اور مذہبی واردات بڑی حد تک مسلم دینیات، فلسفہ اور تصوف میں جذب ہو گئے۔ درحقیقت اس امر کی شہادت موجود ہے کہ تصوف کے بعض مکاتب نے جو اسلامی مکاتب کی حیثیت سے معروف ہیں اصلاً مجوسی نوع کے مذہبی تجربے کا اعادہ کیا ہے۔ میں مجوسیت کو بھی دیگر انسانی تہذیب کی اصناف کی طرح ایک ثقافتی صنف گردانتا ہوں اور میں نے اس لفظ کو تہمت یا بہتان کے طور پر ہرگز استعمال نہیں کیا۔ اس کے اپنے قطعی تصورات تھے، اس کے فلسفیانہ مباحث تھے، اس کی سچائیاں اور اس کی غلطیاں تھیں۔ لیکن جب کوئی ثقافت زوال کا شکار ہونا شروع ہو جاتی ہے تو اس کے فلسفیانہ مباحث اس کے تصورات اور مذہبی تجربے کی اشکال جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی تہذیب اپنی تاریخ کے اس دور میں تھی جب اسلام منصفہ شہود پر جلوہ افروز ہوا اور تاریخ تہذیب کے میرے مطالعے کے مطابق اس تہذیب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ خود قرآن کریم میں اس بات کی قطعی شہادت موجود ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اسلام کا ارادہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر بلکہ مذہبی تجربے کے لیے بھی نئی راہیں کھول دے۔ ہم نے مجوسیت سے جو ورثہ پایا اس نے حیات اسلام کا جیتے جی گلا گھونٹ دیا اور اس کی اصل روح، تمنائوں اور آرزوؤں کو نشوونما نہ پانے دیا۔“

ہوں۔ مجھے عرض کرنے دیجیے۔

اول: اسلام ناگزیر طور پر ایک مذہبی فرقہ ہے جس کی حدود متعین ہیں۔ توحید الہی پر ایمان، جملہ رسولوں پر ایمان اور محمد ﷺ کی ختم نبوت پر ایمان۔ ایمان کا آخر الذکر حصہ دراصل وہ عنصر ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حد فاصل کا تعین کرتا ہے اور یہ فیصلہ کرنے کی استعداد بخشا ہے کہ کوئی شخص، گروہ یا فرقہ کا حصہ ہے یا نہیں۔ مثلاً براہمنوں کو مانتے ہیں۔ وہ محمد ﷺ کو خدا کے پیغمبروں میں سے ایک سمجھتے ہیں تاہم انھیں مسلمانوں کا حصہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ قادیانیوں کی طرح رسولوں کے ذریعہ سے تسلسل و جی کے نظریے پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ کہ وہ محمد ﷺ کی ختم نبوت کے قائل نہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے اسلام کے کسی فرقے نے اس حد فاصل کو عبور نہیں کیا۔ فارس (اب ایران) کے بہائیوں نے علی الاعلان نظریہ خاتمیت کو مسترد کیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ وہ ایک نیا فرقہ ہیں اور لفظ کے اصطلاحی اعتبار سے وہ ”مسلمان“ نہیں ہیں۔ ہمارے عقیدے کے مطابق بحیثیت ایک مذہب کے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو وحیاً نازل کیا لیکن ایک معاشرے یا ملت کے طور پر اسلام کا وجود گلیتار رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات کا رہن منت ہے۔ میری دانست میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راستے کھلے ہیں: یا صاف طریقے سے بہائیوں کی تقلید کریں یا اسلام میں نظریہ خاتمیت (ختم نبوت) کے بارے میں اپنی تعبیرات کو ترک کر دیں اور اس نظریے کو اس کے جملہ مضمرات سمیت قبول کر لیں۔ ان کی عیارانہ تعبیرات محض ان کی اسلام کے زمرے میں رہنے کی خواہش کا نتیجہ ہے تاکہ وہ بدیہی طور سے اس کے سیاسی فوائد سے بہرہ مند ہوتے رہیں۔

دوم: ہمیں قادیانیوں کی اپنی حکمت عملی اور عالم اسلام کی جانب ان کے رویے کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک نے اپنے پوری فرقے کو پھٹے ہوئے دودھ کا نام دیا جب کہ اپنے مقلدوں کو تازہ دودھ سے تعبیر کیا اور مؤخر الذکر کو انتباہ کیا کہ وہ اول الذکر کے ساتھ میل جول نہ رکھیں۔ مزید، ان کا مبادیات سے انکار، خود کو ایک فرقے کے طور سے احمدیوں کا نام دینا اسلام کی اجتماعی عبادات میں شمولیت نہ کرنا ان کا شادی بیاہ وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں کا سماجی مقاطعہ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کا پورے عالم اسلام کو کافر قرار دینا، یہ تمام چیزیں خود

قادیانیوں کی جانب سے اعلان علیحدگی پر دلالت کرتی ہیں۔ دراصل متذکرہ بالا حقائق سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں زیادہ دور ہیں جتنے سکھ ہندومت سے کیونکہ سکھ کم سے کم ہندوؤں میں شادی بیاہ تو کرتے ہیں اگرچہ وہ ہندو مندروں میں عبادت نہیں کرتے۔ سوئم: یہ معلوم کرنے کے لیے کہ قادیانیوں کا مذہبی اور سماجی لحاظ سے علیحدگی کی حکمت عملی پر کار بند رہنے کے باوصف وہ سیاسی اعتبار سے اسلام کے زمرے میں شامل رہنے پر کیوں مصر ہیں، کسی خصوصی ذہانت کی حاجت نہیں۔ اسلامی زمرے میں رہنے کے باعث سرکاری ملازمتوں کے شعبے میں سیاسی فوائد حاصل ہونے سے قطع نظریہ بدیہی بات ہے کہ ان کی آبادی کے پیش نظر (گزشتہ مردم شماری کے مطابق یہ صرف ۵۶ ہزار تھی) وہ ملک کی کسی بھی مقننہ میں ایک نشست کے بھی حقدار نہیں اور اس لیے انھیں سیاسی اقلیت بھی نہیں سمجھا جاسکتا اس اعتبار سے جس اعتبار سے آپ یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اس امر کے پیش نظر کہ قادیانیوں نے خود کو ایک علیحدہ سیاسی وحدت کے طور پر تسلیم کرانے کا مطالبہ نہیں کیا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنی آبادی کے لحاظ سے ملک کے کسی بھی قانون ساز ادارے میں نیابت کے مستحق قرار نہیں پاتے۔ نئے دستور میں ایسی اقلیتوں کے تحفظ کا اہتمام موجود ہے۔ میری رائے میں یہ واضح ہے کہ علیحدگی کے ضمن میں حکومت سے مطالبہ کرنے کے بارے میں قادیانی کبھی پہل نہیں کریں گے۔ مسلم فرقہ یہ مطالبہ کرنے میں بالکل حق بجانب ہو گا کہ انھیں فوری طور پر پوری فرقے سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت فی الفور اس مطالبہ پر کان نہیں دھرتی تو ہندی مسلمانوں کو یہ شبہ دامن گیر ہو جائے گا کہ برطانوی حکومت نئے مذہب کو داشته آید بہ کار کے طور سے ذخیرہ کرنا چاہتی ہے اور علیحدگی میں تاخیر روا رکھ رہی ہے، ان کی تھوڑی تعداد کی وجہ سے صوبے میں چوتھے فرقے کی موجودہ ناقص کارکردگی مقامی مقننہ میں مسلمانان پنجاب کی برائے نام اکثریت کو موثر طریقے سے نقصان پہنچانے کا باعث بن سکتی ہے۔ حکومت نے ۱۹۱۹ء میں سکھوں کی جانب سے کسی رسمی مطالبے کا انتظار نہیں کیا تھا، اب وہ قادیانیوں کی طرف سے ایک رسمی عرضداشت کا کیوں انتظار کرے؟

(۴)

رومن حکومت کے تحت یہودی سالمیت

”پندرہ روزہ اسلام“ (قادیانی جریدہ) کے نمائندہ خصوصی نے ڈاکٹر سر محمد اقبال سے دریافت کیا کہ کیا قادیان کے مرزا بشیر الدین محمود نے حالیہ خطبہ جمعہ کے دوران ان کے خیالات کی صحیح ترجمانی کی جسے ایک قادیانی جریدہ ”سن رائز“ نے اس طرح شائع کیا:

”انھیں (ڈاکٹر اقبال کو) حکومت کے خلاف ایک شکایت ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ انگریز اتنے دانشمند بھی نہیں جتنے یسوع مسیح کے زمانے میں رومن تھے کیونکہ آخر کار رومنوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا تھا۔ اس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ رومنوں کی کارروائی کی منظوری دی جا رہی ہے کہ انھوں نے اپنی حاکمیت کو بالائے طاق رکھ کر یسوع مسیح کو یہودیوں کے حوالے کر دیا تھا مؤخر الذکر کے جنونی شرا بے سے متاثر ہونے کے بعد“

ہمارے نمائندہ خصوصی نے کہا کہ میں آپ کی خصوصی توجہ متذکرہ بالا عبارت میں ”رومنوں کی کارروائی کی منظوری دی جا رہی ہے“ کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ”کیا پیغمبر اسلام کی خاتمیت کے بارے میں آپ کا بیان کچھ عرصہ قبل انڈین اور اینگلو انڈین پریس میں شائع ہوا“ سر محمد اقبال نے کہا۔

یہ غلط ترجمانی کے قادیانی فن کی ایک مثال ہے کہ مرزا محمود نے میرے بیان میں ایک جملہ پڑھ لیا جس کا وہ حوالہ نہیں دیتا اور جسے میں اس بیان میں تلاش نہ کر سکا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ہی میرے جملے کا روپ دے دیتے ہیں۔ بدیہی بات یہ ہے کہ چونکہ ان کے پاس میرے بیان کے مرکزی خیال کے خلاف کچھ کہنے کو نہ تھا اس لیے اپنے غریب مقلدوں کو فریب میں مبتلا کرنے کے لیے یہ بات کہہ دی اور شاید حکومت کو بھی اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ چونکہ میں یہ باور کرتا ہوں کہ یہودیوں کو رومن حکومت کے تحت اس سے زیادہ بہتر تحفظ حاصل تھا

جتنا کہ ہندی مسلمانوں کو انگریزوں کے تحت حاصل ہے لہذا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میں یہ تصور کرتا ہوں کہ یہودی مذہبی فیصلے کو رومن گورنر نے منظوری عطا کی اور وہ اسے ایک نیک عمل سمجھتا تھا۔ اس سے بری غلط ترجمانی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ میں رومنوں کے بارے میں کوئی اخلاقی فیصلہ صادر کروں۔ میرے بیان میں صورت حال پر خالصتاً سیاسی لحاظ سے نظر ڈالی گئی اخلاقی نقطہ نگاہ سے نہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ رومن یہ سمجھتے تھے کہ وہ آئینی اعتبار سے یہودی دینی مجلس کے فیصلوں کو منظور کرنے کے پابند ہیں ان امور میں جنہیں یہودی صحیح یا غلط اپنے معاشرے کے لیے خطرناک تصور کرتے ہوں۔ یسوع مسیح علیہ السلام کے خلاف مقدمے کی اس خصوصی مثال میں بد نصیبی کی بات یہ ہے کہ رومن ریاست کو یہودیوں کے صومعے یا مذہبی مجلس کے اس شخص کے بارے میں فیصلہ کو تسلیم کرنا پڑا جو ہمارے عقیدے کے مطابق حقیقتاً رسول تھے۔ اگر یہ کسی مذہبی طالع آزما کا معاملہ ہوتا تو کوئی بھی اخلاقی طور پر رومنوں پر الزام نہ دھرتا کہ انھوں نے یہودیوں یا ان کی مذہبی مجلس کے اس فیصلے کو کیوں منظوری عطا کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ ذاتی طور سے میں اس آئینی تحفظ کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کر سکتا جو رومنوں نے یہودیوں کو دے رکھا تھا اگرچہ میں اس تحفظ کی اخلاقی قدر کے بارے میں مختلف رائے رکھتا ہوں۔ یہ عین اغلب ہے کہ کسی دن خود قادیانیوں کو اپنے باغی رسولوں کے خلاف تحفظ کی ضرورت پیش آجائے جن کے بارے میں اسلام کے دینی تصورات کو عامیانہ رنگ دے رکھا ہے جس کی بنا پر پھل پھول رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کسی وقت اتنی قوت فراہم کر سکتا ہے کہ وہ اس فرقے کی موجودہ تنظیم کے لیے خطرہ بن جائے۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک فرقہ جس نے اپنی ولادت اور نشو و نما کا تمام تر انحصار ایک جدید ریاست کی آزاد روی پر کیا مذہبی طالع آزماؤں کے خلاف اسلام کے تحفظ کے مطالبے پر خفا ہو۔

قادیانی منطق ایک بار پھر میرے بیان میں یہ تجویز دیکھتی ہے کہ برطانوی حکومت کو چاہیے کہ قادیانی تحریک کو بزور قوت کچل دے۔ میں نے اپنے بیان میں یہ بات صاف طریقے سے واضح کی ہے کہ ہند میں مذہبی امور میں عدم مداخلت کی حکمت عملی ناگزیر ہے جو مذہبی فرقوں کا

(۵)

اسلام اور احمدیت

کلکتہ کے جریدے ”ماڈرن ریویو“ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے تین مضمون شائع ہونے کے بعد مجھے مختلف مذہبی اور سیاسی مکاتب فکر سے متعلق مسلمانوں کے خطوط موصول ہوئے ہیں ان خطوں کے لکھنے والوں میں سے بعض نے لکھا ہے کہ میں احمدیوں کے بارے میں مزید وضاحت کروں اور مسلمانان ہند کے احمدیوں کے متعلق رویے کا جواز پیش کروں۔ دیگر لوگوں نے مجھ سے یہ دریافت کیا ہے کہ احمدیت میں ٹھیک ٹھیک مابہ النزاع مسئلہ کیا ہے؟ اس بیان میں پہلے تو میں ان مطالبات کا جواب دوں گا جو میرے خیال میں بالکل حقیقی ہیں اور پھر میں ان سوالات کے جواب دوں گا جو پنڈت جواہر لال نہرو نے اٹھائے ہیں۔ تاہم مجھے خدشہ ہے کہ اس بیان کے بعض حصوں میں پنڈت کو دلچسپی نظر نہ آئے گی۔ ان کا وقت بچانے کے لیے میں تجویز کروں گا کہ وہ ایسے حصوں پر سے صرف نظر کر لیں۔ میرے لیے یہ کہنا بالکل غیر ضروری ہے کہ میں پنڈت جی کی دلچسپی کا خیر مقدم کرتا ہوں ایسے معاملے میں جسے میں مشرق یا شاید دنیا کے عظیم ترین مسائل میں سے ایک سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ پہلے قوم پرست ہندی رہنما ہیں جنہوں نے عالم اسلام میں موجودہ روحانی اضطراب کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس بے چینی کے بہت سے پہلوؤں اور ممکنہ رد عمل کے پیش نظر یہ پسندیدہ بات ہے کہ غور و فکر کے عادی ہندی سیاسی رہنما اپنے ذہن کے دروازے یہ جاننے کے لیے وا کر دیں کہ اس وقت اسلام کا دل کیوں مضطرب ہے۔

میں اس بات کو پنڈت یا اس بیان کے قارئین سے چھپانا نہیں چاہتا کہ پنڈت کے مضامین نے میرے ذہن کو ملے جلے جذبات کا ایک تکلیف دہ تاثر دیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ وسیع ثقافتی ہمدردیوں کے آدمی ہیں میں یہ قبول کرنے پر آمادہ ہوں کہ انہوں نے جو سوالات اٹھائے ہیں انہیں سمجھنے کی ان کی خواہش بالکل حقیقی ہے تاہم انہوں نے جس انداز سے اظہار

مسکن ہے۔ میں آزاد روی کا مداح نہیں ہوں اور اسے ایسے تجلیات کا مجموعہ سمجھتا ہوں جو انسان کو وہ کچھ بنا دیتے ہیں جو اسے نہیں ہونا چاہیے تاہم میں اس سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ جدید دنیا میں ایک طاقتور قوت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یا تو مرزا محمود ”ناگزیر“ کا مطلب نہیں جانتے یا اسے آسانی سے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔

رومنوں کو چاہیے یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروؤں کو ایک نئے فرقے کی حیثیت سے تسلیم کر لیتے۔ لیکن یہودی معاشرے کو تحفظ دینے کی یہ راہ اس وقت ان کے سامنے کھلی نہ تھی کیونکہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عدالت میں لایا گیا تو اس وقت عملاً ان کے کوئی مقلد نہ تھے۔ تاہم ہند میں برطانیہ کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ انتظامی اعتبار سے قادیانیوں کو ایک علیحدہ فرقہ تسلیم کرے۔ میں دیانتداری سے یہ سمجھتا ہوں کہ امن کی منزل کی طرف یہی راہ جاتی ہے۔ نہ ہی قادیانیوں کو ایسے فرقے کا جزو رہنے پر بے قرار ہونا چاہیے جسے وہ فرقہ کفار قرار دیتے ہیں۔

بیان کیا ہے اس سے ایسی نفسیات مترشح ہوتی ہے جسے ان کے ساتھ منسوب کرنا میرے لیے دشوار امر ہے۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ قادیانیت پر میرے بیان سے جو اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک مذہبی نظریے کو جدید خطوط پر ظاہر کر دیا جائے پنڈت اور قادیانیوں دونوں کو تکلیف پہنچی۔ دونوں داغی طور پر مختلف وجوہ کی بنا پر مسلمانوں کے بالخصوص ہند میں سیاسی اور مذہبی ہم آہنگی کے امکانات مضطرب ہوئے۔ یہ بدیہی بات ہے کہ ہندی قوم پرست، جس کی سیاسی مثالیت ہندی نے عملاً اس کے شعور حقائق کو موت کی نیند سلا دیا، یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں حق خود ارادیت کا جذبہ بیدار ہو۔ میرے خیال میں وہ یہ غلط سوچتے ہیں کہ ہندی قوم پرستی کے حصول کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ملک کے ثقافتی وجودوں کو بالکل برباد دیا جائے جن کے باہمی روابط سے ہند میں بہت عمدہ اور دیر پا ثقافت جنم لے سکتی ہے۔ ایسی قوم پرستی، جو اس طرح کے حربوں سے حاصل ہوگی کا مطلب باہمی تلخی اور ظلم و ستم کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بھی بعینہ بدیہی بات ہے کہ قادیانی بھی ہندی مسلمانوں میں بیداری کی لہر سے متحوش ہیں کیونکہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندی مسلمانوں کے سیاسی وقار میں اضافہ ان کے ان عوام کو ملیا میٹ کر دے گا کہ وہ رسول عربی ﷺ کی امت میں سے ہندی پیغمبر کے لیے ایک نئی امت تشکیل دے سکیں گے۔ میرے لیے یہ کچھ کم حیرت کی بات نہیں ہے کہ یہ بات ہندی مسلمانوں کے ذہن نشین کرانے کی میری کوشش ان کی ہند میں تاریخ کے اس اہم لمحے میں داخلی یک جہتی از بس ضروری ہے اور انھیں اصلاح کی تحریکوں کے روپ میں انتشار کی قوتوں کے خلاف میرے انتباہ نے پنڈت کو ایسی قوتوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کا موقع فراہم کر دیا۔

تاہم میں پنڈت کی نیت کے تجزیہ کا ناخوشگوار فریضہ مزید انجام دینا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں کے استفادے کی غرض سے جو قادیانیوں کے بارے میں عام مسلمانوں کے رویے کی مزید وضاحت کے خواہاں ہیں میں دیوران کے فلسفے کی کہانی (Durant's Story of Philosophy) سے ایک اقتباس کا حوالہ دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ اس سے قادیانیت کے مابہ النزاع مسئلہ کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔ دیوران نے چند جملوں میں عظیم فلسفی اسپینوزا کے جماعت سے اخراج کے بارے میں یہودی نقطہ نظر کا لب لباب بیان کر دیا ہے۔ قاری کو یہ ہرگز

خیال نہ کرنا چاہیے کہ اس اقتباس کے حوالے میں اسپینوزا اور بانی احمدیت کے مابین کوئی موازنہ پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ان دونوں کے مابین دانش و بینش اور کردار دونوں کے اعتبار بعد مشرقین ہے۔ ”خدا مست“ اسپینوزا نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ ایک نئی تنظیم کا مرکز ہے اور جو یہودی اس پر ایمان نہیں لاتے وہ صہیونیت کے دائرے سے خارج ہیں۔ لہذا دیوران کی عبارت کا اطلاق زیادہ شد و مد کے ساتھ قادیانیت کے خلاف مسلمانوں کے عام رویے پر ہوتا ہے۔ اسپینوزا کے اخراج کے ضمن میں یہودیوں کے رویے پر یہ اقتباس حسب ذیل ہے:

”مزید برآں، بزرگوں کے نزدیک ایسٹریڈم میں یہودیوں کے چھوٹے سے گروہ کو انتشار و افتراق سے محفوظ رکھنے کے لیے مذہبی اتحاد واحد راستہ تھا اور تقریباً آخری ذریعہ تھا اتفاق کے تحفظ کا اور اسی طرح سے ساری دنیا میں منتشر یہودیوں کی بقا یقینی بنائی جاسکتی تھی۔ اگر ان کی اپنی ریاست ہو، اپنا سول قانون، ان کے اپنے نظم و نسق کا لا مذہبی نظام اور وہ قوت جو داخلی طور سے باہمی اتحاد پر مجبور کر سکے اور خارجی اعتبار سے احترام حاصل کر سکے تب ان میں زیادہ رواداری ہو سکتی تھی۔ لیکن ان کا مذہب ان کے لیے حب الوطنی بھی ہے اور دین بھی، ان کی عبادت کا، ان کی سماجی اور سیاسی زندگی کا محور بھی ہے اور عبادت کا مرکز بھی اور ان کی بائبل (کتاب مقدس) ان لوگوں کی چلتی پھرتی پدروطن۔ ان حالات میں وہ سمجھتے تھے کہ سنی سنائی بات کرنا غداری ہے، رواداری خود کشی کے مترادف ہے۔

ایسٹریڈم میں یہودی ایک اقلیتی فرقہ تھا۔ وہ اسپینوزا کو افتراق برپا کرنے والی قوت قرار دینے میں بالکل حق بجانب تھے جس سے ان کے فرقے کو تہہ و بالا ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اسی طرح سے ہندی مسلمان قادیانی تحریک کو جو عالم اسلام کو کافر قرار دیتی ہے اور ان کا معاشرتی مقاطعہ کرتی ہے ہند میں اسلام کی اجتماعی زندگی کے لیے زیادہ بڑا خطرہ گردانے میں بمقابلہ اسپینوزا کی مابعد الطبیعیات کے جو یہودیوں کی اجتماعی زندگی کے لیے ہو سکتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک ہندی مسلمان کو اس کی چھٹی حس خبردار کرتی ہے کہ ہند میں اس کے حالات خاص نوعیت کے ہیں اور قدرتی طور پر وہ انتشار پھیلانے والی قوتوں کے خلاف زیادہ حساس ہے کسی اور ملک کے مسلمانوں کے مقابلے میں۔ میرے خیال میں ایک عام مسلمان کا یہ حیاتی فہم

بالکل درست ہے اور مجھے اس باب میں مطلق شبہ نہیں کہ اس کی ہندی مسلمانوں کے شعور میں عمیق تر بنیاد موجود ہے۔ جو لوگ اس نوع کے معاملے میں تحمل کی بات کرتے ہیں وہ تحمل کا لفظ نہایت بے احتیاطی سے استعمال کرتے ہیں یا پھر مجھے غدشہ ہے کہ وہ لفظ تحمل کے معنی بالکل نہیں سمجھتے۔ تحمل کا احساس انسانی ذہن کے مختلف رویوں سے پیدا ہوتا ہے جیسا کہ گبن کہتا ہے:

”تحمل فلسفی کا ہوتا ہے جس کے نزدیک جملہ مذاہب یکساں طور سے سچ ہوتے ہیں، مؤرخ کا ہوتا ہے جس کے نزدیک سب کے سب یکساں طور پر جھوٹے ہوتے ہیں اور سیاستدان کا ہوتا ہے جس کے نزدیک سب کے سب یکساں طور پر مفید ہوتے ہیں۔ پھر ایک شخص کا تحمل ہوتا ہے جو فکر کے دیگر رویوں کو برداشت کرتا ہے کیونکہ وہ خود فکر کے ان تمام رویوں سے لا تعلق رہا ہوتا ہے۔ کمزور انسان کا تحمل ہوتا ہے جو محض اپنی کمزوری کے سبب سے ان تمام باتوں اور ذلتوں کو گوارا کرے جو ان اشیاء اور اشخاص پر ڈھیر کر دی جاتی ہیں جو اسے عزیز ہوں۔“

یہ بدیہی بات ہے کہ اس نوع کے تحمل کی کوئی اخلاقی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ برعکس ازیں ان سے صریحاً اس شخص کی روحانی ناداری کا اظہار ہوتا ہے جو ان پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ حقیقی تحمل کا ادراک دانش اور روحانی وسعتوں سے ہوتا ہے۔ یہ روحانی اعتبار سے ایک طاقتور انسان کا تحمل ہے جو اپنے دین کی حدود کی حفاظت کے بارے میں فکر مند ہو لیکن اپنے دین کے علاوہ دیگر مذاہب کی جملہ صورتوں کو گوارا کرے بلکہ انھیں سراہے۔ اس نوع کے تحمل کا صرف ایک صحیح مسلمان ہی اہل ہو سکتا ہے۔ اس کا اپنا دین تو امتزاج آمیز ہوتا ہی ہے چنانچہ اسی وجہ سے وہ آسانی دیگر مذاہب میں ہمدردی اور لائق تعریف اسباب دریافت کر سکتا ہے۔ ہمارے ایک عظیم ہندی شاعر حضرت امیر خسرو اس نوع کے تحمل کا لب لباب ایک بت پرست کی کہانی میں اجاگر کرتے ہیں۔ اس بت پرستی کے شغف کی تفصیل بیان کرنے کے بعد شاعر اپنے مسلمان قارئین سے اس طرح خطاب کرتے ہیں:

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری

ہم زوے آموز پرستش گری

صرف خدا کا عاشق صادق ہی (بتوں سے) والہانہ وابستگی کو سراہ سکتا ہے اگرچہ اس کی

سمت بتوں کی جانب ہے جس پر وہ ایمان نہیں رکھتا۔ ہمیں تحمل کا درس دینے والوں کی حماقت یہ ہے کہ وہ اس شخص کے رویے کو تعصب کا نام دیتے ہیں جو اپنے ایمان کی حدود کی حفاظت قابل رشک حد تک کرتا ہو۔ وہ اس رویے کو غلط طریقے سے اخلاقی اعتبار سے احساس کمتری کا شکار کہتے ہیں۔ وہ یہ بات نہیں سمجھتے کہ اس کے اس رویے کی قدر و قیمت صریحاً حیاتیاتی ہے۔ جب ایک گروہ کے اراکین یہ محسوس کرتے ہوں، جبلی طور پر یا عقلی استدلال کی بنیاد پر، کہ جس معاشرتی نظم سے وہ متعلق ہیں اس کی اجتماعی زندگی خطرے میں ہے تو ان کے دفاعی رویے کو حیاتیاتی معیار کے حوالے سے ہی پرکھنا چاہیے۔ اس جہت میں ہر فکر یا عمل کو زندگی میں اس کی قدر و قیمت کے تناظر میں ہی دیکھنا ہو گا۔ اس معاملے میں سوال یہ نہیں ہے کہ اس شخص کے بارے میں جسے ملحد یا زندیق قرار دیا جا چکا ہے کسی فرد یا گروہ کا رویہ اخلاقی اعتبار سے اچھا ہے یا برا۔ سوال یہ ہے کہ یہ حیات بخش ہے یا زندگی کے لیے تباہ کن۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو یہ سوچتے ہیں کہ ایک ایسے معاشرہ کے پاس جس کی بنیاد ہی اصولوں پر اٹھائی گئی لازمی طور سے ایک احتسابی ادارہ بھی ہونا چاہیے۔ یہ عیسائیت کی تاریخ کے لحاظ سے تو درست ہے لیکن پنڈت کی منطق کے برعکس تاریخ اسلام یہ ثابت کرتی ہے کہ گزشتہ تیرہ سو برس کے دوران مسلم ممالک احتسابی ادارے سے بالکل نا آشنا رہے۔ قرآن کریم اس طرح کے ادارے کی خاص طور پر ممانعت کرتا ہے۔

”دوسروں کی کوتاہیوں کا کھوج مت لگاؤ اور اپنے بھائیوں کے بارے میں کہانیاں نہ پھیلاؤ“ درحقیقت پنڈت تاریخ اسلام کے مطالعے سے یہ جان لیں گے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جنھیں اپنے ملکوں میں مذہب کی بنیاد پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا انھیں ہمیشہ عالم اسلام میں ہی پناہ ملی۔ دو باتیں جن پر اسلام کے تصوراتی ڈھانچے کی اساس استوار ہے اس درجہ سہل ہیں کہ وہ کسی کو ملحد قرار دینے کے ضمن میں سنی سنائی باتوں پر قیاس کو تقریباً ناممکن بنا دیتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ جب کسی شخص کے بارے میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ وہ ملحدانہ نظریات کا حامل ہے اور وہ نظریات معاشرتی نظام کے شکست و ریخت کا باعث بن سکتے ہیں تو ایک آزاد مسلم مملکت یقیناً اس کے خلاف کارروائی کرے گی لیکن یہ کارروائی خالصتاً مذہبی ہونے کی بجائے زیادہ تر سیاسی

نوعیت کی ہوگی۔ میں یہ بات بخوبی محسوس کر سکتا ہوں کہ پنڈت جیسا کوئی شخص جو ایسے معاشرے میں پیدا ہوا ہو اور پروان چڑھا ہو جس کی نہ خاص طور سے متعین حدود ہوں اور نہ بدیں وجہ کوئی داغی یک جہتی ہو وہ یقیناً یہ سمجھنے میں دشواری محسوس کرے گا کہ ایک مذہبی معاشرہ کس طرح پنپ سکتا اور خوش رہ سکتا ہے جب تک کہ لوگوں کے ایمان اور عقائد کے بارے میں حکومت کی جانب سے مقرر کردہ فقہی ادارے کے ذریعے تحقیقات نہ کرائی جائیں۔ یہ اس عبارت سے عیاں ہے جس کا وہ کارڈینل نیومین کی جانب سے حوالہ دیتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ میں کسی حد تک کارڈینل کے اصول کا اسلام پر اطلاق گوارا کر لوں گا۔ اجازت دیجئے کہ میں انہیں بتا دوں کہ کیتھولک ازم اور اسلام کے داغی ڈھانچے میں زبردست فرق ہے۔ جہاں، جیسا کہ مسیحیت کی تاریخ ظاہر کرتی ہے، پیچیدہ اور غیر معمولی نوعیت کے متعدد عقیدوں نے ہمیشہ ملحدانہ تعبیرات کے امکانات کی نشوونما کی ہے۔ محمد ﷺ کا عقیدہ دو چیزوں پر مبنی ہے۔ اللہ ایک ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نیک لوگوں کے اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں جو ہر عہد اور جملہ ممالک کی زندگی بسر کرنے کے درست طریقے کی جانب رہنمائی کرنے کے لیے بھیجے گئے۔ اگر بعض عیسائی مصنف یہ سمجھتے ہیں کہ ایک راسخ عقیدے کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ یہ ایک انتہائی عقلی قضیہ ہوتا ہے جسے مذہبی سالمیت کے حصول کی خاطر اس کی الہیاتی اہمیت کو سمجھے بغیر قبول کر لیا جائے تو اس اعتبار سے اسلام کے ان دو سہل سے قضیوں کو راسخ عقیدے کے طور پر بھی بیان نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان دونوں کی پشت پر بنی نوع انسان کا تجربہ موجود ہے اور ان کی حمایت میں عقلی استدلال کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک بدعتی عقیدے کا تعلق ہے، فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ اس کا مصنف زمرے میں ہے یا اس سے باہر ہے۔ یہ سوال اس وقت اٹھ سکتا ہے جب ایک مذہبی معاشرہ جس کی اساس ان دو سہل قضیوں پر استوار ہو اور کوئی ملحد ان دونوں قضیوں کو یا ان میں سے ایک کو مسترد کرتا ہو۔ اس طرح کا ملحدانہ عقیدہ تاریخ اسلام میں نادر ہونا چاہیے اور رہا ہے جو اپنی حدود کے قابل رشک تحفظ کے ساتھ ان حدود میں رہتے ہوئے تعبیر و تاویل کی آزادی عطا کرتا ہو اور چونکہ اس نوع کا ملحدانہ عقیدہ جو اسلام کی سرحدوں کو متاثر کرتا ہو تاریخ اسلام میں نادر رہا ہے اس لیے ایک عام مسلمان کے احساسات میں قدرتی طور سے شدت آجاتی ہے جب کبھی اس قبیل کی

کوئی بغاوت اٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانان ہند کا احساس قادیانیوں کے خلاف اس درجہ شدید ہے۔

یہ درست ہے کہ مسلمانوں کے مختلف ذیلی فرقوں میں چھوٹے چھوٹے قانونی اور دینیاتی نکتوں پر الحاد کے الزامات ایک عام سی بات ہے۔ دینیات کے چھوٹے سے نکتے پر اختلاف اور انتہائی ملحدانہ معاملات میں جس صورت میں ملحد کا دائرہ اسلام سے اخراج لازم ہو جائے لفظ کفر کے اس بے محابا استعمال سے آج کل کے کچھ پڑھے لکھے مسلمانوں کو جنہیں مسلمانوں کے دینیاتی تنازعوں کی تاریخ کی کچھ خبر نہیں، ان امور میں مسلمانوں کے معاشرتی اور سیاسی انتشار کی علامت نظر آتی ہے۔ تاہم یہ بالکل غلط تصور ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ دینیات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اختلاف کے چھوٹے چھوٹے نکتوں پر الحاد کا الزام عائد کرنا تباہ کن قوت کا کام کرنے کی بجائے اصل اشہب دینیاتی فکر کے لیے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ پروفیسر ہرگروچ کہتے ہیں کہ ”جب ہم قانون محمدی ﷺ کے ارتقا کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر عہد کے علما و فضلا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کو ملحد ٹھہرا دیتے ہیں اور دوسری طرف وہی لوگ عظیم تر اتحاد مقصد کی خاطر اپنے پیش روؤں کے اسی نوع کے تنازعات کو حل کرنے میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔“ مسلم دینیات کا طالب علم اس بات سے باخبر ہے کہ مسلم ماہرین قانون اس نوع کے الحاد کو ”الحاد زیر الحاد“ کا نام دیتے ہیں اور اس نوع کے الحاد سے مجرم کا اخراج لازم نہیں آتا۔ تاہم اس امر کا اعتراف ہونا چاہیے کہ ملاؤں کے ہاتھوں میں جن کی عقلی سہل انگاری جملہ دینیاتی فکری مخالفت کو حقیقی مخالفت پر محمول کرتی ہے اور نتیجتاً انہیں اختلاف میں اتحاد نظر نہیں آتا یہ چھوٹی سی زندگی ایک بڑی شرارت کا منبع بن جاتی ہے۔ اس شرارت کا علاج صرف اس طرح سے ممکن ہے کہ ہم اپنے دینی مدارس کے طلباء کو اسلام کی حقیقی روح کی واضح تصویر سے متعارف کرا دیں اور انہیں دینیاتی منطقی بحث و استدلال کے فن سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ کسی بھی تحریک کے اصول کی منطقی استرداد کی ضرورت سے واقف ہو جائیں۔ بڑے الحاد کا سوال اسی وقت اٹھے گا جب کسی مفکر یا مصلح کی تعلیمات اسلام اور ایمان کی سرحدوں کو متاثر کریں۔ بد نصیبی کی بات یہ ہے کہ یہ سوال قادیانیت کی تعلیم کے ضمن میں یقینی طور پر اٹھتا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ہو جانی

چاہیے کہ قادیانی تحریک دو گروہوں میں منقسم ہے: قادیانی اور لاہوری۔ اول الذکر علی الاعلان بانی تحریک کو ایک مکمل رسول کہتا ہے۔ مؤخر الذکر نے عقیدہ تباہ حکمت عملی کے نقطہ نظر سے یہ مناسب سمجھا کہ قادیانیت کو ذرا دھیمے سروں میں رکھا جائے۔ تاہم یہی سوال کہ کیا احمدیت کے بانی رسول تھے؟ دونوں گروہوں کے مابین وجہ نزاع ہے اور اسے ہی میں بڑا الحاد کہتا ہوں۔ میرے مقاصد کے لیے احمدیوں کی اس داخلی بحث کے حق و باطل کے بارے کوئی رائے قائم کرنا غیر ضروری ہے۔ میں اس کا قائل ہوں جس کے وجوہ کی ابھی وضاحت کی جائے گی، کہ پورے رسول کا یہ تصور ہی ایسا ہے جو متعلقہ شخص کے اسلام سے اخراج کا باعث بنتا ہے۔ اور احمدیت کے لیے از بس ضروری ہے اور یہ کہ قادیانیوں کے موجودہ سربراہ لاہوریوں کے امام کے مقابلے میں تحریک کی روح سے زیادہ استقامت کے ساتھ قائل اور ہم آہنگ ہیں۔

اسلام میں نظریہ خاتمیت کی ثقافتی قدر و قیمت کی میں نے کسی اور جگہ پوری تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ اس کا مطلب سادہ سا ہے۔ محمد ﷺ کے بعد کسی اور ذی روح کے سامنے روحانی اعتبار سے سر تسلیم خم نہ کیا ہو جنھوں نے اپنے پیروؤں کو ایک قانون عطا کر کے نجات دلا دی ہو جو اس لیے ممکن العمل ہو کہ وہ انسانی شعور سے برآمد ہوا۔ دینیات کے اعتبار سے معاشرتی و سیاسی تنظیم جسے ”اسلام“ کہا جاتا ہے مکمل اور دائمی ہے۔ محمد ﷺ کے بعد وحی و الہام ممکن نہیں جس سے انکار الحاد و زندہ بقی ہے۔ وہ جو اس نوع کی وحی کا دعویٰ دار ہے وہ اسلام کا غدار ہے۔ چونکہ قادیانی یہ یقین رکھتے ہیں کہ بانی تحریک کو الہام ہوتا تھا اسی لیے وہ تمام عالم اسلام پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ بانی کا اپنا استدلال از منہ وسطیٰ کے ماہر دینیات کی شان کے شایان ہے کہ اگر پیغمبر اسلام ﷺ ایک اور رسول کی تخلیق نہیں کر سکتے تو ان کی روحانیت کو نامکمل تصور کرنا چاہیے۔ بانی تحریک دعویٰ کرتے ہیں کہ خود ان کی رسالت پیغمبر اسلام ﷺ کی روحانیت کی رسول تخلیق کرنے کی قوت کی شہادت ہے۔ لیکن اگر آپ ان سے مزید دریافت کریں کہ کیا محمد ﷺ کی روحانیت ایک سے زیادہ رسول تخلیق کرنے کی اہل ہے تو ان کا جواب ہوگا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ محمد ﷺ آخری نبی نہیں تھے آخری نبی میں ہوں۔ تاریخ بنی نوع انسان میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص اسلامی نظریہ خاتمیت کی ثقافتی قدر و قیمت کو سمجھنے کے بجائے وہ (بانی

تحریک) سمجھتے ہیں کہ خاتمیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر محمد ﷺ کا کوئی اور پیرو کار منصب رسالت تک نہیں پہنچ سکتا تو یہ بات محمد ﷺ کی رسالت میں خامی پر دلالت کرتی ہے۔ جب میں ان کے ذہن کا نفسیاتی مطالعہ کرتا ہوں کہ وہ خود تو پیغمبر اسلام ﷺ کی روحانیت کی تخلیقی صلاحیت سے استفادہ کرتے ہیں لیکن حضور رسالت مآب ﷺ کو ایک طرف تو خاتمیت سے محروم کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ رسول اکرم ﷺ کی صلاحیت تخلیق رسالت کو صرف ایک رسول کی حد تک محدود کر دیتے ہیں یعنی بانی تحریک احمدیت تک۔ اس طرح سے نیا رسول ان سے خاموشی کے ساتھ خاتمیت سر قہ کرتا ہے جن کے بارے میں وہ دعویٰ دار ہے کہ وہ اس کے روحانی پیشوا تھے۔

وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بروز ہیں اور بروز ہونے کے ناتے یہ اتہام لگاتے ہیں کہ ان کی (بانی تحریک احمدیت کی) خاتمیت حقیقتاً محمد ﷺ کی ہی خاتمیت ہے۔ اس لیے ان کے اس معاملے میں نقطہ نظر سے حضرت رسول اکرم ﷺ مجروح نہیں ہوتی۔ دو خاتمیتوں کی نشاندہی کر کے یعنی اپنی خاتمیت اور حضور رسالت مآب ﷺ کی خاتمیت وہ نہایت آسانی کے ساتھ نظریہ خاتمیت کے دنیوی مفہوم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ تاہم یہ بھی بدیہی بات ہے کہ لفظ بروز (مکمل یکسانیت کے معنی میں) بھی ان کی دستگیری نہیں کر سکتا کیونکہ بروز تو اصل کی دوسری سمت ہوتا ہے۔ صرف آواگون کے اعتبار سے بروز اصل کے یکساں بن سکتا ہے۔ پس اگر ہم لفظ بروز کے یہ معنی سمجھ لیں کہ ”روحانی صفات میں ایک جیسا“ تب بھی دلیل غیر موثر رہتی ہے۔ اگر دوسری جانب ہم اس لفظ کے آریائی مفہوم کے مطابق آواگون (عقیدہ تناخ) کے مطابق بروز بمطابق اصل کے لیں تو دلیل تو قابل قبول ہو جاتی ہے لیکن اس کا مصنف مجوسی کا بہروپ دھار لیتا ہے۔

عظیم مسلم صوفی محی الدین ابن العربی ہسپانوی کے تتبع میں مزید یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی مسلم ولی اللہ اپنی روحانیت کے ارتقا کے دوران اس نوع کا تجربہ حاصل کرے جو رسالت کی صفات سے متصف ہوتا ہے۔ میں ذاتی طور پر ابن العربی کے اس نظریے کو نفسیاتی اعتبار سے غلط سمجھتا ہوں لیکن اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ درست ہے تو بھی قادیانی دلیل مکمل طور سے اپنے موقف کو غلط طور سے سمجھنے پر مبنی ہوگی۔ شیخ ابن العربی اسے خالصتاً نجی

کامیابی پر محمول کرتے ہیں اور جو صوفی کو اس امر کا مجاز نہیں ٹھہراتے کہ جو اس پر ایمان نہیں لائے گا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوگا۔ دراصل شیخ کے نقطہ نظر سے ایک ہی عہد اور ایک ہی ملک میں شعور رسالت کے حامل ایک سے زیادہ اولیائے کرام زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ لائق توجہ نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ کسی ولی کے لیے نفسیاتی طور سے تجربہ رسالت کا حصول ممکن ہے لیکن اس کی وہ معاشرتی، سیاسی اہمیت نہیں جو انھیں ایک نئی تنظیم کا مرکز قرار دے اور انھیں یہ اختقاق عطا کر دے کہ وہ یہ اعلان کر سکیں کہ یہ تنظیم ہی محمد ﷺ کے پیروؤں کے لیے معیار ایمان و کفر ہے۔

اس کی صوفیانہ نفسیات سے قطع نظر مجھے فتوحات کی متعلقہ عبارت کے محتاط مطالعے سے یہ یقین ہو گیا ہے کہ اس عظیم ہسپانوی صوفی کو محمد ﷺ کی ختم نبوت پر اتنا ہی یقین تھا جتنا کہ کسی راسخ العقیدہ مسلمان کو ہو سکتا ہے۔ اور اگر انھوں نے اپنے صوفیانہ کشف میں یہ دیکھ لیا ہوتا کہ مشرق میں کوئی ہندی تصوف میں عطائی، ان کی صوفیانہ نفسیات کے زیر اثر رسول مقبول ﷺ کی ختم نبوت کو تباہ کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ یقیناً علمائے ہند کے ذریعہ سے مسلمانان عالم کو اسلام کے ان غداروں کے خلاف پیشگی انتباہ کر دیتے۔

احمدیت کے لب لباب کی جانب آتے ہوئے اس کے ذرائع اور ان طریقوں پر گفتگو جن کے توسل سے ماقبل اسلام مجوسی تصورات اسلامی تصوف کی راہوں سے درآئے اور انھوں نے اس کے مصنف کے ذہن پر کیا کیا اثرات مرتب کیے مطالعہ تقابل ادیان کے نقطہ نظر سے بے حد دلچسپ ہوگا۔ تاہم میرے لیے اس بحث کو یہاں چھیڑنا ناممکن ہوگا۔ اتنا کہنا کافی ہوگا کہ احمدیت کی اصل روح ازمنہ وسطی کے تصوف اور دینیات کی دھند کے پیچھے مستور ہے۔ لہذا ان خالصتاً دینیاتی تحریک تصور کیا اور دینیاتی اسلمہ لے کر اس سے نبٹنے کے لیے نکل آئے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس تحریک سے نبرد آزما ہونے کے لیے یہ درست طریقہ نہیں تھا۔ چنانچہ علما کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ محض جزوی تھی۔ بانی کے الہامات کا ایک محتاط نفسیاتی تجزیہ شاید ان کی ذات کی داخلی زندگی کی تشریح کا ایک موثر ذریعہ ہو۔ اس ضمن میں مولوی منظور الہی کی اس تالیف کا میں ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انھوں نے بانی کے الہامات جمع کیے ہیں۔ یہ تالیف نفسیاتی تحقیق کے لیے قابل قدر اور متنوع قسم کا مواد مہیا کرتا ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب بانی تحریک

کے کردار اور شخصیت کے بارے میں ایک کلید فراہم کرتی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ جدید نفسیات کا کوئی جوان سال طالب علم کسی دن اس کتاب کو بنجیدہ مطالعہ کے لیے منتخب کرے گا۔ اگر وہ قرآن کریم کو اپنا معیار بنائے جوان و جوہات کی بنا پر اشد ضروری ہوگا جن کی یہاں وضاحت نہیں کی جاسکتی اور اپنے مطالعہ کو بانی تحریک احمدیہ کے تجربات کا ہم عصر غیر مسلم صوفیوں مثلاً بنگال کے رام کرشن کے تجربات سے تقابل تک لے جائے گا تو مجھے یقین ہے کہ اسے اس تجربے کے ناگزیر کردار پر ایک سے زیادہ مرتبہ تعجب کا سامنا کرنا ہوگا جس کی بنا پر احمدیت کے بانی نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

ایک عام آدمی کے نقطہ نظر سے ایک اور یکساں طور پر موثر اور زیادہ ثمر آور طریقہ کاریہ ہوگا کہ احمدیت کے حقیقی مشمولات کو ہند میں تاریخ اسلامی دینیات کی فکر کی روشنی میں سمجھا جائے کم سے کم ۱۷۹۹ء سے۔ یہ سال عالم اسلام کی تاریخ میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال ٹیپو کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس شکست کا مطلب تھا کہ ہند میں مسلمانوں کے سیاسی وقار کی امیدوں کا دیا بجھ گیا۔ اسی سال جنگ نوارینیو لڑی گئی جس نے ترکیہ کے بحری بیڑے کو تباہی کے گھاٹ اترتے دیکھا۔ اگر کوئی سرنگا پٹم جائے تو وہ ٹیپو کے مزار کی دیوار پر یہ الفاظ نقش دیکھے گا ”عظمت ہند و روم رفت شد“ اس نوشتہ کے مصنف کے ان الفاظ کی پیش گوئی میں کس قدر صداقت ہے۔ پس اس طرح ۱۷۹۹ء میں ایشیا میں اسلام کا سیاسی زوال اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ لیکن جس طرح یوم عینا کے موقع پر جرمنی کی تذلیل سے جدید جرمن قوم نے جنم لیا بعینہ اسلام کی سال ۱۷۹۹ء میں سیاسی تذلیل کے بطن سے جدید اسلام اور اس کے مسائل پیدا ہوئے۔ اس بات میں بھی اتنی ہی صداقت ہے۔ اس نکتہ کی میں اس کے مقام پر وضاحت کروں گا۔ فی الوقت تو میں قارئین کی توجہ ان چند سوالات کی طرف منعطف کروں گا جو مسلم ہند میں ٹیپو کے زوال اور ایشیا میں یورپی سامراجیت کے ارتقا کے زمانہ سے ابھرے۔

کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کی نشاندہی کرتا ہے؟ کس طرح سے ہندی مسلمانوں بلکہ ترکی سلطنت سے باہر حملہ مسلمانوں کی خلافت عثمانیہ سے وابستگی قائم تھی؟ کیا ہند دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟ اسلام میں نظریہ جہاد کے حقیقی معنی کیا ہیں؟ قرآن کریم کی اس آیت

کریمہ میں کہ ”اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں“ تم میں سے اولی الامر، سے کیا مراد ہے؟ احادیث رسالت مآب ﷺ میں امام مہدی کے ظہور کی پیش گوئی کی کیا نوعیت ہے؟ یہ سوالات اور چند اور جو بعد ازاں پیدا ہوئے بدیہی وجوہ کی بنا پر صرف ہندی مسلمانوں کے لیے تھے۔ یورپی سامراج کو بھی جو نہایت سرعت کے ساتھ عالم میں داخل ہو رہا تھا ان سے گہری دلچسپی تھی۔ ان سوالات نے جو مباحث اٹھائے وہ ہند میں تاریخ اسلام کا بہت دلچسپ باب ہے۔ یہ داستان خاصی طویل ہے اور ابھی بھی ایک زوردار قلم کی منتظر ہے۔ مسلم سیاستدان جن کی نگاہیں صورت حال کے حقائق پر لگی ہوئی تھیں علما کے ایک ایسے طبقے کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جنھوں نے دینیاتی استدلال کا ایسا ڈھب اختیار کر لیا جو ان کے خیال میں صورت حال کے موافق تھا لیکن صرف منطق کے بل پر ایسے عقائد پر فتح پانا سہل نہیں ہوتا جو صدیوں سے ہند میں مسلمان عوام کے دلوں پر راج کر رہے ہوں۔ ایسی صورت حال میں منطق یا تو سیاسی مصلحت کی بنا پر کام کرتی ہے یا متن اور روایات کی تازہ تعبیر و تاویل کی بنا پر۔ بہر صورت دونوں صورتوں میں استدلال عوام کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔ کٹر مذہبی پیروان اسلام کے لیے ایک ہی بات قابل قبول ہو سکتی ہے اور وہ ہے تحکم الہی۔ پرانے عقائد کو مؤثر طریقے سے زائل کرنے کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ مذکورہ بالا سوالات میں مضمر دینیاتی نظریات کی سیاسی اعتبار سے مناسب تعبیر و تاویل کو الہامی بنیاد فراہم کر دی جائے۔ یہ الہامی بنیاد احمدیت نے نے مہیا کی اور احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ برطانوی سامراج کی عظیم ترین خدمت ہے جو انھوں نے سرانجام دی۔ سیاسی اہمیت کے دینیاتی نظریات کو پیغمبرانہ الہامی بنیاد فراہم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مدعی کے خیالات کو تسلیم نہیں کرتے وہ اول درجے کے کافر ہیں اور جہنم کا ایندھن بننا ان کا مقدر ہے۔ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں تحریک کی اہمیت کے لحاظ سے احمدیوں کا یہ عقیدہ کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک فانی انسان کی موت سے ہمکنار ہوئے اور ان کے دوبارہ ظہور کا مطلب محض ایک ایسے شخص کا ظاہر ہونا ہے جو روحانی طور پر ”بالکل ان جیسا ہو“ تحریک کو ایک طرح کی عقلی صورت عطا کرتا ہے۔ لیکن یہ روح تحریک کے لیے دراصل لازمی نہیں۔ میرے خیال میں یہ مکمل نبوت کے تصور کے لیے صرف ابتدائی اقدامات تھے جنھیں آخر کار نئی سیاسی قوتوں کے مقاصد کو

پورا کرنے کے لیے جنم دیا گیا۔

قدیم ممالک میں منطق کی بجائے حکم چلتا تھا۔ کافی مقدار میں جہالت اور جوش اعتقادی حیرت انگیز طور پر کافی ذہانت کے ساتھ یکجا ہو سکتی ہیں اور ایک شخص جو جرات رندانہ کاما ملک ہو یہ اعلان کر سکتا ہے کہ اسے خدائے تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوتا ہے جس کا انکار کرنے والا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملعون و مقہور قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک غلام مسلم ملک میں ایک آسان بات ہے کہ ایسی سیاسی دینیات ایجاد کر لی جائے اور ایسا فرقہ تشکیل دے دیا جائے سیاسی غلامی جس کا مسلک ہو اور پنجاب میں تو مہتمم دینیاتی اظہار کا ایک بھدا سا بنا ہوا جال نہایت آسانی سے معصوم کسانوں کو پھانس سکتا ہے جو صدیوں سے ہر قسم کے استحصال کا شکار بننے پر آمادہ ہوں۔ پنڈت جواہر لال نہرو و جملہ مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگوں کو متحد ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ طنزیہ مشورہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ احمدیت ایک اصلاحی تحریک ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ جہاں تک ہند میں اسلام کا تعلق ہے احمدیت میں اعلیٰ ترین اہمیت کے مذہبی اور سیاسی ایشو دونوں مضمر ہیں۔ جیسا کہ میں نے مذکورہ بالا سطور میں وضاحت کی احمدیت کا مقصد اسلامی مذہبی فکر کی تاریخ میں ہند کی موجودہ سیاسی غلامی کے لیے الہامی بنیاد فراہم کرنا ہے۔ خالصتاً مذہبی ایشو سے قطع نظر محض سیاسی ایشو کی بنیاد پر، میں سمجھتا ہوں، پنڈت جواہر لال نہرو جیسے انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ہندی مسلمانوں پر رجعت پرندانہ قدامت پرستی کا الزام عائد کریں۔ مجھے اس باب میں مطلق شبہ نہیں کہ اگر وہ احمدیت کی اصل نوعیت کو سمجھ لیتے تو وہ ایک مذہبی تحریک کے بارے میں ہندی مسلمانوں کے رویے کو بے حد سراسیمہ جو (احمدیت) ہند کے دکھوں کو منجانب اللہ ہونا قرار دیتے ہیں۔

پس قاری یہ مشاہدہ کرے گا کہ احمدیت کی جو پیلاہٹ ہم ہندی اسلام کے رخساروں پر دیکھتے ہیں وہ ہند میں مسلمانوں کے مذہبی فکر کی تاریخ میں اچانک عنصر کے طور پر نمودار نہیں ہوگی۔

وہ تصورات، جنھوں نے آخر کار اس تحریک کی شکل اختیار کی بانی احمدیت کی پیدائش سے بہت پہلے دینیاتی مباحث میں نمایاں ہو گئے تھے۔ نہ ہی میری غرض یہ الزام لگانا ہے کہ بانی تحریک احمدیت اور ان کے ساتھیوں نے عمداً اپنا منصوبہ ترتیب دیا۔ میں یہ کہنے کی جرات کرتا

زیادہ خالص شکل میں برآمد ہوگا۔ وقت بدل رہا ہے۔ ہند میں حالات ایک نئے موڑ پر مڑ گئے ہیں۔ جمہوریت کی نئی روح جو ہند میں جلوہ گر ہو رہی ہے یقیناً احمدیوں کو یہ باور کرا دے گی کہ ان کی دینیاتی اختراعات بے کار محض ہیں۔

نہ ہی اسلام قرون وسطیٰ کے تصوف کے احیا کو برداشت کرے گا جس نے اپنے پیروؤں سے ان کی صحت مند جبلتوں کو تو پہلے ہی لوٹ لیا ہے اور اس کے عوض انہیں صرف غیر واضح اور مبہم سوچ دی ہے۔ اس نے گزشتہ صدیوں کے دوران اسلام کے بہترین اذہان کو تو جذب کر لیا اور امور مملکت محض معمولی استعداد کے لوگوں کی تحویل میں دے دیے۔ جدید اسلام اس تجربے کو دہرانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی یہ پنجاب کے تجربے کو دہرانا برداشت کر سکتا ہے کہ وہ لوگوں کو نصف صدی تک ایسے دینیاتی مباحث میں الجھاتے رکھے جن کا زندگی سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اسلام پہلے ہی تازہ فکر اور تجربے کے منور دن میں نکل آیا ہے اور اب اسے کوئی صوفی یا نبی قرون وسطیٰ کے تصوف کی دھند میں واپس نہیں لے جاسکتا۔

اب میں اپنی توجہ پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کی جانب مبذول کرتا ہوں۔ مجھے خدشہ ہے کہ پنڈت کے مضامین سے یہ امر آشکار ہوتا ہے کہ انہیں نہ اسلام کا کوئی علم ہے اور نہ ہی انیسویں (۱۹) صدی میں اس کی مذہبی تاریخ سے کوئی واقفیت اور نہ ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے وہ کچھ پڑھا ہے جو میں ان کے سوالات کے موضوع پر پہلے لکھ چکا ہوں۔

میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں وہ سب کچھ یہاں دوبارہ سپرد قلم و قریاس کر دوں جو میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ نہ ہی یہ ممکن ہے کہ یہاں ۱۹ ویں صدی میں اسلام کی مذہبی تاریخ دہرا دی جائے جس کے بغیر عالم اسلام کی موجودہ صورت حال کا کوئی حصہ سمجھنا ناممکن ہے۔ ترکی اور جدید اسلام پریکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ میں نے یہ بہت سا ادب پڑھا ہے اور شاید پنڈت نے بھی اسے پڑھا ہوتا ہم میں انہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی مصنف اس معلول کو اس علت کا سبب سمجھتا ہو جس نے اسے پیدا کیا ہو۔ یہ از بس ضروری ہے کہ ۱۹ ویں صدی کے دوران ایشیا میں مسلم فکر کے بڑے مدو جزر کی جانب مختصراً اشارہ کر دیا جائے۔

ہوں کہ بانی احمدیت نے یقیناً کوئی آواز سنی ہوگی لیکن یہ آواز اس جی و قیوم کی جانب سے آئی یا لوگوں کی روحانی بضاعتی کی طرف سے بلند ہوئی اس کا تمام پر انحصار اس تحریک کی نوعیت پر ہونا چاہیے جسے اس نے جنم دیا اور اس فکر اور جذبے کی نوع پر جو اس نے ان لوگوں کو عطا کیا جنہوں نے اس آواز پر کان دھرے۔ قاری کو یہ قیاس نہ کرنا چاہیے کہ میں استعارہ زبان استعمال کر رہا ہوں۔ اقوام کی زندہ تاریخ حیات اس امر کا اظہار کرتی ہے کہ جب کسی قوم میں زندگی کی لہر انگڑائی لینا شروع کرتی ہے تو انحطاط فی نفسہ ترغیب کا منبع بن جاتا ہے جو اس کے شعراء فلسفیوں، صوفیاء برین کو ترغیب دیتا ہے اور انہیں اوتاروں کے ایک قبیلے کی ہیئت عطا کر دیتا ہے جن کا واحد وظیفہ حیات یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کی زندگی میں ہر مذموم اور بھدی شے کو گمراہ کن منطقی فن کے ذریعے سے عظمت بخش دے۔ وہ اوتار غیر شعوری طور پر مایوسی کو امید کے خیرہ کن لباس میں ملبوس کر دیتے ہیں، کردار کی روایتی اقدار کو ضرر پہنچاتے اور اس طرح ان لوگوں کی روحانی قوت کو تباہ کر دیتے ہیں جو ان کے جنگل میں پھنس جائیں۔ کوئی بھی شخص ان لوگوں کی قوت ارادی کی زبوں حالی کا صرف تصور ہی کر سکتا ہے جو احکام الہیہ کے تحت اپنے سیاسی ماحول کو حتمی طور پر قبول کرنے پر مجبور کر دیے جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمدیت کے ڈرامے میں جس قدر کردار تھے وہ سب انحطاط کے ہاتھوں میں معصوم رہے تھے۔ بعینہ اسی نوع کا ایک ڈرامہ پہلے ہی فارس (اب ایران) میں کھیلا جا چکا ہے لیکن وہ ان مذہبی اور سیاسی عواقب تک نہ لے جاسکا اور نہ لے جاسکتا تھا جنہیں احمدیت نے ہند میں اسلام کے لیے تخلیق کیا۔ روس نے باہیت کے ساتھ رواداری اور تحمل کا برتاؤ کیا اور بایوں کو اشک آباد میں اپنا پہلا تبلیغی مرکز قائم کرنے کی اجازت دی۔ انگلستان نے بھی احمدیوں کو ووٹنگ میں پہلا تبلیغی مرکز قائم کرنے کی اجازت عطا کر کے ان کے ساتھ اسی رواداری کو برتا۔ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار امر ہے کہ روس اور انگلستان نے اس تحمل کا مظاہرہ سامراجی مصلحت کی بنا پر کیا یا خالصتاً وسیع النظری کی بنیاد پر۔ البتہ اتنی بات بالکل واضح ہے کہ اس رواداری نے اسلام کے لیے ایشیا میں نہایت دشوار مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اسلام کے ڈھانچے کے پیش نظر، جیسا کہ میں اسے سمجھتا ہوں، میرے ذہن میں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام ان دشواریوں سے جو اس کے لیے پیدا کی گئیں

میں اوپر یہ کہہ چکا ہوں کہ ۱۷۹۹ء کے برس میں اسلام کا سیاسی انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ تاہم اسلام کی داخلی قوت کی اس سے عظیم تر سند اور کیا ہو سکتی ہے کہ عملاً اس نے دنیا میں اپنے مقام کے حصول میں کوئی وقت نہیں لیا۔ ۱۹ویں صدی کے دوران ہند میں سرسید احمد خان پیدا ہوئے، سید جمال الدین افغانی افغانستان میں اور مفتی عالم جان روس میں۔ ان صاحبوں نے غالباً محمد ابن عبد الوہاب سے اثر قبول کیا جو ۱۷۰۰ء میں نجد میں پیدا ہوئے۔ بانی نام نہاد وہابی تحریک جسے درست طور پر جدید اسلام میں زندگی کی پہلی دھڑکن کہا جاسکتا ہے۔ سرسید احمد خان کا اثر من حیث المجموع ہند تک ہی محدود رہا۔ تاہم یہ اغلب ہے کہ وہ پہلے جدید مسلمان ہوں جنہوں نے آنے والے عہد کے اثباتی کردار کی جھلک دیکھ لی ہو۔ اسلام کے دکھوں کا مداوا جو انہوں نے تجویز کیا، جیسا کہ مفتی عالم جان نے روس میں تجویز کیا وہ جدید تعلیم کا حصول تھا۔ لیکن ان کی حقیقی عظمت اس حقیقت میں مضمر تھی کہ وہ پہلے ہندی مسلمان تھے جنہوں نے اسلام کی تازہ تعبیر کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے کام کیا۔ ہم ان کے مذہبی تصورات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی حساس روح نے سب سے پہلے جدید عہد پر رد عمل کا اظہار کیا۔ ہندی مسلمانوں کی انتہائی قدامت پسندی جس کی زندگی کے حقائق پر سے گرفت بالکل ڈھیلی پڑ چکی تھی سید احمد خان کے مذہبی رویے کے اصلی معنی و مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ ہند کے شمال مغربی علاقے جو باقی ماندہ ملک کے مقابلے میں زیادہ قدیم اور زیادہ پیر پرست تھے سید کی تحریک کے جلد ہی بعد احمدیت کا رد عمل ظاہر ہوا۔ سامی اور آریائی تصوف کا ایک حیرت انگیز آمیزہ جس میں پرانے اسلامی تصوف کے اصولوں کے مطابق روحانی احیاء کی داخلی پاکیزگی کی بجائے عوام کے متوقع رویے کی کٹھنی کے لیے ”مسح موعود“ کا تصور فراہم کر دیا گیا۔ ”مسح موعود“ کا کار منصبی فرد کو حال کی ناتوانی سے نجات دلانا نہیں تھا بلکہ اس کی انا کو غلامانہ انداز میں اس کے احکام کے تابع کرنا تھا۔ اس رد عمل میں ایک نہایت لطیف تضاد موجود تھا۔ یہ اسلام کے نظم کو تو برقرار رکھتا تھا لیکن اس عزم کو تباہ کرتا تھا جس کی مضبوطی کا وہ نظم داعی تھا۔

مولانا سید جمال الدین افغانی مختلف چہرے مہرے کے آدمی تھے۔ قدرت کا نظام بھی عجیب و غریب ہے مذہبی فکر اور عمل دونوں کے اعتبار سے ہمارے زمانے کا ایک بے حد ترقی

یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوا۔ دنیا کے تقریباً تمام مسلم ممالک کی زبانوں کا ماہر جنہیں قدرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ دلوں کو موہ لینے والے فن خطابت سے نوازا تھا۔ ان کی بے قرار روح انہیں ایک مسلم ملک سے دوسرے میں لیے پھرتی رہی۔ انہوں نے فارس (اب ایران) مصر اور ترکیہ کی بے حد ممتاز شخصیتوں کو متاثر کیا۔ ہمارے عہد کے عظیم ترین ماہرین دینیات جیسے مفتی محمد عبدہ اور نئی نسل کے افراد جنہوں نے بعد ازاں سیاسی قیادت سنبھالی مثلاً مصر کے زاعلوط پاشا ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے ان کے سامنے زانوائے تلمذ تہذیب کیا۔ انہوں نے کبھی نبی یا مصلح ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تاہم ان سے زیادہ اور کسی نے ہمارے زمانے میں روح اسلام کو اتنا گہرا نہیں جھنجھوڑا۔ ان کا جذبہ اب بھی عالم اسلام میں روبہ عمل ہے اور کون جانے کہ وہ کب اور کہاں ختم ہوگا۔

تاہم یہ دریافت کیا جاسکتا ہے کہ ان عظیم مسلمانوں کا ٹھیک ٹھیک مقصد کیا تھا؟ جواب ہے کہ انہوں نے یہ جان لیا تھا کہ تین بڑی قوتیں عالم اسلام پر حکمران ہیں۔ انہوں نے اپنی توانائی ان قوتوں کے خلاف بغاوت برپا کرانے پر مرکوز کر دی۔

۱- ملائیت: علما ہمیشہ اسلام کے لیے زبردست تقویت کا باعث رہے لیکن صدیوں کے دوران بالخصوص بغداد کی تباہی کے بعد انہوں نے قدامت پرستی کی عبا زب تن کر لی اور اجتہاد کی آزادی کی رہ مسدود کر دی یعنی امور قانون میں آزاد فیصلے کا اختیار سلب کر لیا۔ وہابی تحریک دراصل ۱۹ویں صدی کے مسلمان مصلحین کا اولین مقصد دین کے تازہ رخ کا تعین کرنا اور ترقی پذیر تجربے کی روشنی میں شریعت (قانون) کی دوبارہ تعبیر و تائیل کی آزادی کا حصول تھا۔

۲- تصوف: مسلمان عوام اس نوع کے تصوف کے چکر میں گرفتار ہو گئے جس نے حقائق کو تو ان کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور انہیں جملہ اقسام کے توہمات کا اسیر بنادیا۔ تصوف اپنی روحانی تعلیم کی ایک قوت کے اعلیٰ و ارفع مقام سے نیچے گرا اور محض لوگوں کی جہالت اور خوش اعتقادی کے استحصال کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔ اس نے بتدریج اور نظر نہ آنے والے طریقہ سے اسلام کو اس کی قوت ارادی سے محروم کرنا شروع کر دیا اور اسے اس حد تک نرم کر دیا کہ (لوگ) شریعت اسلام کی سخت نظم کی پابندیوں سے خلاصی طلب کرنے لگے۔ ۱۹ویں صدی کے مصلحین نے اس تصوف

جدید عالم اسلام کا سطحی مبصر نہیں ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ عالم اسلام کا موجودہ بحران بیرونی قوتوں کی کارکردگی کا نتیجہ ہے۔

پھر کیا بیرون ہند عالم اسلام نے یا بالخصوص ترکی نے اسلام کو خیر باد کہہ دیا ہے؟ پنڈت جواہر لال نہرو یہ گمان کرتے ہیں کہ ترکی ایک مسلمان ملک نہیں رہا۔ وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ آیا ایک شخص یا گروہ مسلمان نہیں رہا، مسلم نقطہ نظر کے اعتبار سے خالصتاً ایک قانونی سوال ہے اور اس کا فیصلہ اسلامی ڈھانچے کے اصولوں کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔ جب تک کہ کوئی شخص اسلام کے دو بنیادی اصولوں کا قائل ہے یعنی اللہ کی توحید اور رسول اکرم ﷺ کی ختم نبوت، بکڑ سے بکڑ ملا بھی اسے زمرہ اسلام سے خارج نہیں کر سکتا خواہ اس کی تعبیر شریعت (قانون) یا متن قرآن کریم کی تاویل کو بھی غلطی پر مبنی خیال کیا جاتا ہو۔ لیکن شاید پنڈت جواہر لال نہرو کے ذہن میں وہ فرض کی گئی یا حقیقی اختراعات ہیں جو اتنا ترک نے رائج کیں۔ آئیے ہم لمحہ بھر کے لیے ان کا جائزہ لیں۔ کیا ترکی میں عام مادیت پرستانہ نظریے کا پروان چڑھنا اسلام دشمن نظر آتا ہے؟ اسلام میں تیاگ دینے اور خیر باد کہنے کا عمل کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ مسلمان حقائق کا سامنا کریں۔ مادیت پرستی مذہب کے مقابلے میں بڑا ہتھیار ہے لیکن یہ ملائیت اور صوفیانہ کاروبار کے لیے خاصا موثر ہے جو لوگوں کی جہالت اور خوش اعتقادی کا استحصال کرنے کے لیے انھیں پر اسراریت کا چکر دیتا ہے۔ روح اسلام مادے کے ساتھ رابطے سے خوفزدہ نہیں۔ درحقیقت قرآن کہتا ہے ”دنیا میں اپنے حصے کو فراموش نہ کرو“۔ ایک غیر مسلم کے لیے اسے سمجھنا مشکل ہو گا۔ گذشتہ چند صدیوں کے دوران عالم اسلام کی تاریخ پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ مادیت پسندانہ نظریے میں ترقی دراصل خود شناسی کی ایک شکل کے سوال کچھ نہیں۔ پھر کیا یہ پرانے لباس کو ترک اور لاطینی رسم الخط کو رائج کرنا ہے؟ ایک دین کی حیثیت سے اسلام کا کوئی ملک نہیں۔ ایک معاشرے کے طور پر اس کی کوئی خاص زبان نہیں۔ کوئی مخصوص لباس نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ترکی میں قرآن کریم کو پڑھنا بھی بلا نظیر نہیں۔ ذاتی طور پر میں اس فیصلے کو ایک سنگین غلطی گردانتا ہوں کیونکہ عربی زبان اور ادب کا ایک طالب علم اس امر سے بخوبی باخبر ہے کہ غیر یورپی زبانوں میں اگر کسی زبان کا مستقبل ہے تو وہ عربی ہے۔ لیکن اطلاعات یہ ہیں کہ

کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور مسلمانوں کو اس کی تاریکی سے جدید دنیا کی روشنی میں نکل آنے کی دعوت دی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ مادہ پرست تھے۔ ان کا مشن یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو اسلام کی اصل روح کی جانب متوجہ کر دیں جس کا مقصد مادہ کی تسخیر تھا، اس سے (پسپا ہو کر) بھاگنا نہیں تھا۔ ۳۔ مسلمان بادشاہوں نے جن کی نظریں محض اپنے موروثی مفادات پر لگی ہوئی تھیں اور جب تک یہ محفوظ تھے، اپنے ملکوں کو زیادہ بولی دینے والے کے ہاتھوں فروخت کرنے میں انھوں نے کبھی پس و پیش نہ کیا۔ عالم اسلام میں اس صورت حال کے خلاف مسلم عوام کو بغاوت کے لیے اکسانید جمال الدین افغانی کا خصوصی مشن تھا۔

یہاں یہ تو ممکن نہیں کہ ان مصلحین نے مسلم فکر اور احساس کی دنیا میں کیا کیا تبدیلیاں برپا کیں ان کا تفصیلی احوال بیان کر دیا جائے۔ تاہم ایک بات واضح ہے کہ انھوں نے کچھ اور لوگوں مثلاً زانلوں پاشا، مصطفیٰ کمال (اتاترک) اور رضا شاہ کے لیے بہت بڑی حد تک زمین ہموار کر دی۔ مصلحین نے تعبیر کی، استدلال کیا اور تشریح کی لیکن ان کے بعد جو لوگ آئے وہ اگرچہ تعلیمی استعداد کے لحاظ سے تو ان سے کم تر درجے کے تھے لیکن انھوں نے اپنی صحت مند جبلتوں پر بھروسہ کیا۔ ان میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ زندگی کے نئے حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کتاب تالیاں کی روشنی میں جو کچھ ضروری ہے کہہ گزریں خواہ اس کے لیے انھیں قوت ہی کیوں نہ استعمال کرنی پڑے۔ ایسے لوگوں سے غلطیوں کا سرزد ہونا عین ممکن ہے لیکن تاریخ اقوام و ملل یہ بتاتی ہے کہ ایسے لوگوں کی غلطیاں بھی بعض اوقات ثمر آور ثابت ہو جاتی ہیں۔ وہ منطق کا سہارا نہیں لیتے بلکہ زندگی کی انتھک جدوجہد پر اعتبار کرتے ہیں جو اپنے مسائل خود حل کرتی ہے۔ یہاں اس امر کی جانب اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ سید احمد خان اور سید جمال الدین افغانی کے مسلم ممالک میں سیکڑوں پیر و کار مغرب زدہ مسلمان نہیں تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مکتب قدیم کے ملاؤں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا اور اس دانش اور روحانی ماحول کو جذب کیا تھا جس کی بعد ازاں انھوں نے تشکیل نو کا عزم کیا تھا۔ جدید تصورات کا دباؤ تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن تاریخ جس کی جانب اوپر اور مختصر اشارہ کیا گیا واضح طور پر یہ بتاتی ہے کہ وہ انقلاب جو ترکی میں رونما ہوا اور جو جلد یا بدیر دیگر مسلم ممالک میں آکر رہے گا، اس کا تعین کم و بیش مکمل طور پر داغی قوتوں نے کیا تھا۔ یہ

ترک پہلے ہی مقامی زبان میں قرآن کریم کی تلاوت کو ترک کر چکے ہیں۔ پھر کیا یہ کثرت از دواج کا خاتمہ یا علما کے لیے لائسنس حاصل کرنا ہے؟ اسلامی شریعت کے مطابق ایک مسلم مملکت کے امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس قانونی ”اجازت“ کو منسوخ کر دے اگر اسے یقین ہو جائے کہ یہ سماجی برائی کو جنم دیتی ہے۔ جہاں تک علما کے لیے لائسنس حاصل کرنے کا تعلق ہے اگر مجھے ایسا کرنے کا اختیار ہو تو میں یقیناً اسے مسلم ہند میں رائج کر دوں۔ ملا کا دیو مالائی کہانیوں کا گھڑنا زیادہ تر ایک عام مسلمان کی حماقت کی وجہ سے ہے۔ اسے لوگوں کی دینی زندگی سے خارج کر کے اتا ترک نے ایسا کارنامہ سرانجام دیا جو ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ جیسے لوگوں کا دل خوش کر دیتا۔ رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے جو ”مشکوٰۃ“ میں نقل ہوئی ہے کہ کسی اسلامی ملک کے امیر یا اس کے نامزد کردہ افراد کو ہی عوام میں تبلیغ کرنے کا استحقاق ہے۔ مجھے علم نہیں کہ اتا ترک اس حدیث مبارکہ سے باخبر تھے یا نہیں تاہم یہ ایک نمایاں بات ہے کہ کس طرح ان کے اسلامی شعور نے اس اہم معاملے میں ان کے اقدام کے حیطہ کار کو منور کر دیا۔ سوئٹزر لینڈ کی تعزیرات کو اس کے ضابطہ وراثت سمیت اختیار کرنا یقیناً ایک سنگین غلطی ہے جو اصلاح کے جو انسال جذبے کے طور لائق معافی ہے بالخصوص ایسی قوم میں جو آگے بڑھنے کے بے پناہ جذبے سے سرشار ہو۔ ملا کی پہنائی کو برسہا برس پرانی بیڑیوں سے نجات کی مسرت بھی بعض اوقات عمل کی غیر آزمودہ راہوں پر گامزن کر دیتی ہے۔ لیکن ترکی اور باقی ماندہ عالم اسلام کو ابھی اسلامی قانونی وراثت کے غیر آشکارا معیشتی پہلوؤں کو محسوس کرنا باقی تھا جنہیں قرآن کریم قانون اسلام کی نہایت ارفع اچھوتی شاخ کا نام دیتا ہے۔ کیا یہ خلافت کا خاتمہ یا کلیسا کی ریاست سے علیحدگی ہے؟ اپنے جوہر کے اعتبار سے اسلام سامراجیت نہیں ہے۔ خلافت کے خاتمہ سے جو بنو امیہ کے عہد سے ایک سلطنت کے روپ میں ڈھل گئی تھی یہ محض روح اسلام ہے جو اتا ترک کے توسل سے روبہ عمل آگئی۔ خلافت کے معاملے میں ترکی اجتہاد کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس ابن خلدون عظیم فلسفی مؤرخ اسلام اور جدید تاریخ نویس کے باوا آدم سے رہنمائی حاصل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں۔ میں اس سے بہتر کچھ نہیں کر سکتا کہ اپنے خطبات سے ایک اقتباس پیش کر دوں۔

ابن خلدون اپنے مشہور مقدمے میں اسلام میں تصور عالمی خلافت کے تین نمایاں نظریے بیان کرتے ہیں (۱) کہ عالمی امامت ایک الہی ادارہ ہے اور نتیجتاً ناگزیر ہے (۲) کہ یہ محض ایک امر مصلحت ہے (۳) کہ اس نوع کے ادارے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آخری نظریہ خوارج کا تھا (اسلام کے شروع کے جمہوریت پسند)۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید ترکی پہلے نظریے سے دوسرے پر چلے گئے یعنی معتزلہ کے نقطہ نظر پر جو عالمی امامت کو محض ایک امر مصلحت قرار دیتے ہیں۔ ترکوں کا استدلال یہ ہے کہ ہمیں اپنی سیاسی سوچ میں اپنے ماضی کے سیاسی تجربے سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے جو صریحی طور پر یہ بتاتا ہے کہ عملاً عالمی امامت ناکام ہو گئی ہے۔ یہ قابل عمل تصور تھا جب سلطنت اسلام قائم و دائم تھی۔ اس سلطنت کی شکست و ریخت کے بعد آزاد سیاسی وحدتیں منصفہ شہود پر ابھریں۔ یہ تصور قابل عمل نہیں رہا اور جدید اسلام کی تنظیم میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت سے کام نہیں کر سکتا۔

نہ ہی کلیسا اور ریاست کے مابین علیحدگی کے تصور میں اسلام کے لیے کوئی اجنبیت ہے۔ شیخہ فارس (ایران) میں بڑے پیمانے پر امام کے نظریہ اخلاف نے ایک اعتبار سے عرصہ دراز قبل اس علیحدگی کو عملی شکل دے دی تھی۔ مذہبی اور سیاسی مناصب میں علیحدگی سے اسلامی تصور کا یورپ کے کلیسا اور ریاست میں علیحدگی کے تصور سے خلط مبحث نہیں کرنا چاہیے۔ اول الذکر محض ایک تقسیم کار ہے جیسا کہ شیخ الاسلام اور وزرا کے عہدوں کے بتدریج قیام سے ظاہر ہے جب کہ مؤخر الذکر روح اور مادے کی مابعد الطبیعیاتی دوئی پر مبنی ہے۔ عیسائیت کا آغاز راہبوں کے سلسلے سے ہوا جس کا دنیوی امور سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسلام شروع ہی سے شہری مدنی معاشرہ تھا، اس کے قوانین بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے مدنی (غیر فوجی) تھے اگرچہ عقیدے کے نقطہ نظر سے ان کی ابتدا وحی یا الہام سے ہوئی۔ مابعد الطبیعیاتی دوئی نے جس پر یورپی تصور مبنی ہے یورپی اقوام میں بہت تلخیاں گھولیں۔ برسوں پہلے امریکہ میں ایک کتاب لکھی گئی تھی جس کا عنوان تھا ”اگر حضرت عیسیٰ شکا گو تشریف لاتے“ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک امریکی مصنف کہتا ہے: ”مسٹر اسٹیڈ کی کتاب سے یہ سبق حاصل کیا جاسکتا ہے کہ وہ برائیاں جن میں آج انسانیت مبتلا ہے وہ برائیاں ہیں جن کا مداوا صرف مذہبی محسوسات کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ اس مداوے کا عظیم

ترجمہ ریاست کی تحویل میں دے دیا گیا، یہ کہ خود ریاست کو بدعنوان سیاسی عناصر کے حوالے کر دیا گیا، یہ کہ عناصر نہ صرف ان برائیوں کا تدارک کرنے کے لیے غیر آمادہ ہیں بلکہ وہ اس کا تدارک کرنے سے قاصر ہیں اور یہ کہ بیداری ہی ان گنت لکھو کھا انسانوں کو اس مصیبت سے بچا سکتی ہے اور ریاست کو ذلت سے۔“

مسلمانوں کی سیاسی تجربے کی تاریخ میں اس علیحدگی کا مطلب علیحدگی فرائض ہے علیحدگی تصورات نہیں۔ یہ قرار نہیں دیا جاسکتا کہ مسلمان ممالک میں کلیسا اور ریاست کے مابین علیحدگی نے مسلمانوں کو قانون سازی کے عمل کو عوام کے اس شعور سے آزاد کر دیا جسے صدیوں کے دوران اسلام کی روحانیت نے تربیت دی اور پروان چڑھایا۔ صرف تجربہ ہی یہ بتائے گا کہ یہ تصور جدید ترکی میں کس طرح کام کرتا ہے۔ ہم محض یہ امید ہی کر سکتے ہیں کہ یہ ان برائیوں کو پیدا نہیں کرے گا جنہیں اس نے یورپ اور امریکہ میں جنم دیا۔

میں نے مذکورہ اختراعات پر مختصر بحث اپنے مسلمان قاری کی خاطر کی ہے پنڈت جواہر لال نہرو کے لیے نہیں۔ جس اختراع کا پنڈت نے خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا وہ ترکوں اور فارسیوں (ایرانیوں) کی جانب سے نسلی اور قومی نظریات کا اختیار کرنا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ترکی اور فارس (ایران) کا ایسے نظریات کے قبول کرنے کا مطلب ہے اسلام کو خیر باد کہہ دینا۔ تاریخ کا طالب علم بخوبی جانتا ہے کہ اسلام ایسے وقت میں منصفہ شہود پر ابھرا جب انسانی اتحاد جیسے خونی رشتے اور شاہی ثقافت کے پرانے اصول ناکامی کی دلیلیں پر تھے۔ لہذا یہ انسانی اتحاد کا اصول خون اور ہڈیوں میں نہیں بلکہ انسانی ذہن میں پاتا ہے۔ درحقیقت اس کا بنی نوع انسان کے لیے معاشرتی پیغام یہ ہے: ”نسل پرستی کے بت کو توڑ دو خونریز جنگ کا شکار ہو جاؤ۔“ یہ کہنا بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ اسلام قدرت کی تعمیر نسل کے منصوبے کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے مخصوص اداروں کے ذریعہ ایسا نظریہ پیدا کرتا ہے جو قدرت کے تعمیر نسل کی قوتوں کا توڑ پیش کر سکے۔ انسانی رہن سہن کے بارے میں اسلام نے ہزار سال میں زیادہ اہم کام کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت دو ہزار برس یا اس سے زیادہ عرصے میں نہ کر سکے۔ یہ کسی معجزے سے کم نہیں کہ ایک ہندی مسلمان مراکش میں خود کو اتنا ہی بے تکلف پاتا ہے کہ جیسے وہ اپنے گھر

میں ہو نسل اور زبان کے فرق کے باوصف۔ تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام کلیتاً نسل کے خلاف ہے۔ اس کی تاریخ بتاتی ہے کہ معاشرتی اصلاح کے ضمن میں یہ بتدریج نسل پرستی کے خاتمہ پر دھیان دیتا ہے اور ایسے خطوط پر آگے بڑھتا ہے جہاں کم سے کم مزاحمت کا خطرہ ہو۔ قرآن کریم کہتا ہے:

”یقیناً ہم نے تمہیں قبیلوں اور ذیلی قبیلوں میں پیدا کیا تاکہ تمہارا تعارف ہو سکے لیکن اللہ کی نظر میں تم میں سے بہترین وہ ہے جو زندگی میں پاکیزہ ترین ہے۔“

یہ سوچتے ہوئے کہ نسل کا مسئلہ اس قدر بڑا اور مہیب ہے نوع انسانی کو اس سے نجات دلانے کے لیے ناگزیر طور پر وہی رویہ اختیار کرنا ہوگا جو اسلام نے اس مسئلہ کے حق میں اپنایا یعنی خود نسل کی تشکیل کا عنصر بنے بغیر اسے تخریر کر لیا جائے۔ یہ واحد اور قابل عمل رویہ ہے۔ سر آتھر کیتھ کی چھوٹی سی کتاب ”مسئلہ نسل“ میں ایک عمدہ عبارت ہے جو یہاں ذکر کرنے کے لائق ہے۔

”اور اب انسان اس حقیقت سے روشناس ہو رہا ہے کہ قدرت کا ابتدائی مقصد تعمیر نسل، جدید اقتصادی دنیا کے تقاضوں سے لگا نہیں کھاتا اور خود سے یہ سوال کر رہا ہے: مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تعمیر نسل کو جسے اب تک قدرت نے اپنا شعار بنائے رکھا ختم کر دیا جائے اور داعی امن کو اپنا لیا جائے یا قدرت کو اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنی بدانی راہ پر گامزن رہے اور یقیناً جنگ کا مزہ چکھتا رہے۔ انسان کو ان دو میں سے ایک راستے کا انتخاب کرنا ہوگا۔ کوئی درمیانی راستہ ممکن نہیں۔“

لہذا یہ بالکل واضح ہے کہ اگر اتنا ترک تورانیت سے متاثر ہوئے تو وہ اتنا روح اسلام کے خلاف نہیں گئے جتنا زمانے کی روح کے خلاف گئے اور اگر وہ نسل پرستی میں کلی یقین رکھتے ہیں تو انہیں جدید عہد کے ہاتھوں یقینی شکست کا سامنا کرنا پڑے گا جو روح اسلام کے عین مطابق ہے۔ تاہم ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ اتنا ترک پان تورانیت سے متاثر ہوئے ہوں گے جیسا کہ میں باور کرتا ہوں کہ یہ ایک سیاسی توڑ ہے پان۔ سلاویت کا، یاپان جرمینیت کا، یاپان اینگلو سیکوینیت کا۔

اگر مندرجہ بالا بیرونی اگراف کا مطلب صحیح صحیح سمجھ لیں تو قوم پرستانہ تصورات کے بارے میں اسلام کے رویے کو سمجھنا دشوار نہیں ہوگا۔ قوم پرستی، حب الوطنی کی خاطر بلکہ اس کے وقار کے تحفظ کے لیے جان قربان کر دینے سے گریز نہ کرنا مسلمانوں کے ایمان کا جزو ہے۔ یہ اسی وقت اسلام

سے متصادم ہوتا ہے جب یہ ایک سیاسی موقف کا روپ دھار لیتا ہے اور انسانی یک جہتی کے اصول کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ اسلام محض ایک نجی رائے کی حیثیت سے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک زندہ عنصر کے طور پر ختم ہو جائے۔ ترکی، فارس (ایران) مصر اور دیگر مسلم ممالک میں یہ ہرگز مسئلہ نہیں بنے گا۔ ان ممالک میں مسلمان عظیم اکثریت میں ہیں اور ان کی اقلیتیں یعنی یہودی، عیسائی اور زرتشتی یا اہل کتاب ہیں یا اہل کتاب کی مانند، جن سے شریعت اسلام آزاد معاشرتی تعلقات استوار کرنے کی اجازت دیتا ہے بشمول شادی بیاہ کے۔ مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ بن جاتا ہے صرف ان ممالک میں جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور قوم پرستی مکمل طور پر خود کو مٹا دینے کا تقاضا کرتی ہے۔ اکثریتی ممالک میں اسلام قوم پرستی کے ساتھ رعایت برتتا ہے کیونکہ وہاں اسلام اور قوم پرستی عملاً ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ اقلیتی ملکوں میں اس کے لیے ایک ثقافتی وحدت کی حیثیت سے خود اختیاریت کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔ بہر صورت یہ خود سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

مذکورہ بالا عبارتیں مختصراً ٹھیک ٹھیک صورت حال پیش کرتی ہیں جو آج عالم اسلام میں موجود ہے۔ اگر اسے صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اسلامی یک جہتی کے بنیادی اصولوں کو خارجی یا داخلی قوتیں کسی طرح سے بھی متزلزل نہیں کرتیں۔ اسلام کی یک جہتی، جیسا کہ میں نے پہلے وضاحت کی، مشتمل ہے اسلام کے دو بنیادی اصولوں پر یکساں عقیدے کے ساتھ اور نہایت ہی معروف ۵ ارکان دین یعنی نماز، زکوٰۃ، صدقہ، روزہ اور حاکم دین یعنی نماز پنجگانہ کی ادائیگی۔ یہ اسلامی یک جہتی کے پہلے ناگزیر اصول تھے، جو ایک اعتبار سے رسول اکرم ﷺ کے زمانے سے رائج رہے تا آنکہ بہائیوں نے فارس (ایران) میں اور قادیانیوں نے ہند میں انھیں درہم برہم کر دیا۔ یہ ضمانت ہے عملاً عالم اسلام میں یکساں روحانی ماحول کے قیام کی، یہ مسلم ممالک میں اتحاد کی سہولت بہم پہنچاتا ہے۔ یہ اتحاد یا تو ایک عالمی ریاست کا روپ دھار سکتا ہے (معیار کمال) یا مسلم ممالک کی ایک لیگ یا متعدد آزاد ریاستیں جن کے معاہدے اور اشتراک خالصتاً اقتصادی اور سیاسی اسباب متعین کریں گے۔ اس طرح سے اس سیدھے سادے دین کے تصوراتی ڈھانچے کا مرور زمانہ سے ربط قائم کیا گیا۔ اس تعلق کی گہرائی کا ادراک بعض آیات قرآنی کی روشنی میں ہی ممکن

ہے جنھیں یہاں بیان کرنے کا مطلب ہو گا کہ ہم اس نکتے سے ہٹ گئے جو فوری طور سے ہمارے سامنے موجود ہے۔ سیاسی طور پر اسلامی یک جہتی کی جڑ بنیاد اس وقت متزلزل ہو جاتی ہے جب دو مسلم ملک ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مذہبی لحاظ سے یہ عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب مسلمان کسی ایک بنیادی عقیدے کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتے ہیں۔ یہ بات دائمی یک جہتی کے مفاد میں ہے کہ اسلام اپنی صفوں میں ایسے باغیوں کو برداشت نہ کرے۔ اسلامی زمرے سے باہر ایسا گروہ اتنی ہی رواداری کا مستحق ہے جتنا کسی اور مذہب کے پیروکار۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فی الوقت اسلام ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ وہ سیاسی یک جہتی کی ایک شکل سے کسی دوسری میں منتقل ہو رہا ہے جسے تاریخ کی قوتوں کو ابھی متعین کرنا ہے۔ جدید دنیا میں واقعات اس سرعت سے رونما ہو رہے ہیں کہ اس بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا بھی کم و بیش ناممکن ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ سیاسی طور پر متحد اسلام کا غیر مسلموں کے بارے میں کیا رویہ ہو گا، اگر ایسی کوئی چیز ظہور پذیر ہوتی ہے، اس کا جواب بھی محض تاریخ ہی دے سکتی ہے۔ میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایشیا اور یورپ کے درمیان واقع ہونے اور زندگی پر مشرقی اور مغربی تصورات کے جزو لاینفک ہونے کے باعث اسلام کو رابطے کا کردار ادا کرنا چاہیے لیکن پھر کیا ہو گا اگر یورپ کی حماقتوں نے ناقابل مصالحت اسلام تخلیق کر دیا جیسا کہ یورپ میں روز بروز واقعات نشوونما پا رہے ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ اسلام کی جانب یورپ کے رویے میں ایک انقلابی تبدیلی آنی چاہیے۔ ہم صرف یہ توقع ہی کر سکتے ہیں کہ سیاسی بصیرت خود کو سامراجی خواہش یا اقتصادی استحصال کے تقاضوں کے دھندلکے میں گم نہیں ہونے دے گی۔ جہاں تک ہند کا تعلق ہے میں ایک بات پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلم ہند ہرگز کسی ایسے سیاسی نظریے کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرے گا جو ان کے ثقافتی وجود کو فنا کر دینے کے درپے ہو۔ اس امر کے تین کے بعد آپ ان پر اس بارے میں اعتماد کر سکتے ہیں کہ انھیں اس کا علم ہے کہ کس طرح مذہب اور حب الوطنی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوا جاسکتا ہے۔ نہرو نے لکھا تھا ”مجھے ایک عرصے سے یہ مہم سا خیال تھا کہ وہ (آغا خان) مشکل ہی پرانے زمرے میں شامل ہوں اور میں نے ان کی اس بات کو سراہا کہ واقعی وہ کس عمدہ طریقے سے وہ چیزیں جمع کر لیتے ہیں اور کس احسن انداز میں اپنی ذات میں وہ متضاد صفات سمو لیتے ہیں جو ایک

(۶)

احمدیوں کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مکتوب

۲۱ جون ۱۹۳۶ء

آپ کے مکتوب کا بہت بہت شکریہ جو مجھے کل موصول ہوا۔ جب میں نے آپ کے مضامین کا جواب دیا میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویے کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ درحقیقت میرے جواب لکھنے کا بڑا سبب یہ دکھانا تھا، بالخصوص آپ کو کہ کس طرح مسلمانوں کی وفاداری کی ابتدا ہوئی اور اس نے کس طرح احمدیت میں الہام کی اساس حاصل کی۔ میرے مقالے کی اشاعت کے بعد مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی ان تاریخی وجوہ کا کچھ علم نہیں جنہوں نے احمدیت کی تعلیمات کو تشکیل دیا۔ مزید برآں آپ کے مداح پنجاب میں اور دیگر مقامات پر آپ کے مضامین سے پریشان ہو گئے کیونکہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ شاید آپ کو تحریک احمدیہ سے ہمدردی ہے۔ احمدی پریس بڑی حد تک آپ کے بارے میں اس غلط فہمی کو پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ تاہم یہ معلوم کر کے مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کے بارے میں میرا تاثر غلط تھا۔ مجھے خود دینیات میں کوئی دلچسپی نہیں لیکن مجھے اس میں تھوڑا سا حصہ اس لیے لینا پڑا کہ میں احمدیوں سے ان کے اپنے محاذ پر نمٹ سکوں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہند کے لیے بہترین ارادوں کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہند دونوں کے غدار ہیں۔

مجھے آپ سے لاہور میں نہ مل سکے کا بے حد افسوس ہے۔ میں ان دنوں میں بہت بیمار تھا اور اپنے گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ گذشتہ دو برس سے مسلسل علالت کے باعث عملاً میں فارغ شدہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آئندہ جب آپ پنجاب تشریف لائیں تو مجھے ضرور اطلاع دیں۔ آپ کی شہری آزادیوں کی مجوزہ یونین کے بارے میں آپ کو میرا خط ملا؟ چونکہ آپ نے اپنے خط میں اس کی وصولیابی کی کوئی اطلاع نہیں دی غصہ ہے کہ وہ آپ تک نہیں پہنچا۔

دوسرے کے خلاف نظر آتی ہیں اور ناقابل مصالحت دکھائی دیتی ہیں“ (ماڈرن ریو لوکلکٹ، نومبر ۱۹۳۵ء صفحہ ۵۰۵) (ایڈیٹر)۔ ہزائی نیس آغا خان کے بارے میں صرف ایک بات۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو آغا خان پر حملہ کرنے کی کیا سوچھی میرے لیے یہ معلوم کرنا مشکل بات ہے۔ شاید وہ یہ سوچتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زمرے میں آتے ہیں۔ وہ بدیہی طور پر اس امر سے واقف نہیں کہ اسماعیلیوں کی دینیاتی توجیہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ دائمی امامت پر یقین رکھتے ہیں لیکن ان کے نزدیک اللہ کی طرف سے نہ امام کو وحی آتی ہے اور نہ الہام ہوتا ہے۔ وہ صرف قانون کا شارح ہے۔ چند روز قبل کی بات ہے کہ الہ آباد کے اسٹار، مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۴ء کے مطابق آغا خان نے اپنے مقلدوں کو یہ تلقین کی: ”اس امر کی شہادت دیجیے کہ اللہ ایک ہے۔ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے، کعبہ سب کا قبلہ ہے۔ آپ مسلمان ہیں اور آپ کو مسلمانوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ السلام علیکم، کہہ کر مسلمانوں کو خوش آمدید کہیے۔ اپنے بچوں کو اسلامی نام دیجیے۔ مسلمانوں کے ساتھ مسجدوں میں نماز پڑھیے۔ باقاعدگی کے ساتھ روزے رکھیے۔ اپنی شادیاں نکاح کے اسلامی ضوابط کے ساتھ کیجیے۔ تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھئے۔“

اب یہ فیصلہ کرنا پنڈت کا کام ہے کہ آغا خان اسلامی یک جہتی کی ترجمانی کرتے ہیں یا نہیں۔

مسابقہ اربعین ختم نبوت 2023ء

(غلام قادر ساقی)

دوسرا سالانہ مسابقہ 16، 17 ستمبر بروز ہفتہ اتوار کو طے پایا، شرکاء کی تعداد تقریباً 40 ہوئی جبکہ فائنل نشست میں 20 طلباء شرکت کے مجاز ٹھہرے۔ نشست اول ہفتہ بعد از مغرب سے رات 00:1 تا 00:9 بجے تک جامعہ رحمت ٹاؤن شپ لاہور جاری رہی جس میں منصف کے فرائض پروفیسر محمد امین بھٹی، مولانا محمد شفیع نذر اور مفتی محمد رمضان غفاری نے ادا کئے جبکہ فائنل راؤنڈ اتوار صبح 00:9 تا 00:1 بجے تک زم زم مارکیٹ میں (نزد جامعہ رحمت) چلا۔ ہجرت حضرات میں ڈاکٹر مفتی محمد حبیب قادری، مفتی عبدالغفار نقشبندی اور مفتی محمد غلام رسول اشرفی تھے اس بار احادیث کی تعداد بڑھ کر 50 کر دی گئی تھی اور ادارہ کی جانب سے سہ ماہی ”المنہج“ جولائی تا دسمبر بطور نصاب اسپیشل نمبر شائع کیا گیا۔

دونوں مسابقتوں کی مکمل ویڈیو تیار ہوئی مزید برآں شرکاء کی مکمل تفصیلات کی فائلیں ادارہ کے پاس بطور ریکارڈ محفوظ ہیں۔ دوسرے مسابقہ کے فائنل شرکاء کے نام حسب ذیل ہیں۔

- 5- حافظ علی ولد محمد ریاض
(جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور)
- 6- فیاض احمد ولد بشیر
(جامعہ الحبیب حبیب آباد چوئیاں روڈ قصور)
- 7- مزمل الرحمن ولد حبیب الرحمن
(جامعہ فریدیہ سہیوال)
- 8- عبدالصمد ولد محمد ندیم
(دارالعلوم شمسیر رضویہ کینٹی روڈ سلاوالی)
- 9- محمد فیضان علی ولد محمد اقبال
(جامعہ قمریہ رضویہ منظور الحق چائن پورہ سلاوالی)
- 10- محمد دانیال ریاض والد محمد ریاض
(جامعہ رضویہ قمر الاسلام تحصیل سلاوالی ضلع سرگودھا)
- 11- علی بلال ولد رحمت علی
(جامعہ رحمت ٹاؤن شپ لاہور)
- 12- حامد اللہ ولد صابر علی
(جامع رحمت ٹاؤن شپ لاہور)
- 13- محمد حسن ولد عبدالرزاق
(جامعہ صدیقہ دلوخورد براہنج جامعہ ام اشرف جمال)
- 14- محمد عبدالجنان ولد محمد شہزاد
(جامعہ صدیقہ دلوخورد براہنج جامعہ ام اشرف جمال)
- 15- ماہیر احمد والد محمد اکرم
(جامعہ فخر العلوم تھانہ نقشبندیہ میاں پارک داروہ والا لاہور)

1- حافظ محمد وسیم ولد محمد یوسف

(جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری گیٹ لاہور)

2- عمیر ظہیر ولد ظہیر احمد

(ڈاکٹر سرفراز نعیمی شہید انسٹیٹیوٹ اسلامک سائنسز)

3- محمد عقیل خان ولد محمد خان

(جامعہ مدینۃ العلم بانپاس روڈ نزد عالم چوک گوجرانوالہ)

4- محمد محسن رضا ولد محمد یونس

(جامعہ غوثیہ رضویہ مین مارکیٹ گلبرگ ٹولاہور)

16- شاہ فیض الرحمن ولد تاجمل انوار الحق

(جامعہ فخر العلوم تضافیہ نقشبندیہ میاں پارک داروغہ والا لاہور)

17- مرزل ندیم ولد ندیم اختر

(دارالعلوم امینہ رضویہ کھیل اعوان)

18- محمد ضیاء القمر ولد محمد یونس

(دارالعلوم امینہ رضویہ کھیل اعوان)

19- محسن چشتی ولد سائیں احمد

(جامعہ رضویہ ماڈل ٹاؤن لاہور)

20- محمد عدیل ولد محمد منشاء

(جامعہ فاطمیہ تعلیم القرآن مغبورہ لاہور)

نوٹ: اللہ کریم کے فضل سے ”ادارۃ المنتہی پاکستان“ کے پلیٹ فارم سے اب تک تقریباً 80 خوش قسمت افراد عقیدہ ختم نبوت پر 150 احادیث سنداً امتناً حفظ کر کے احادیث مبارکہ کے نور سے اپنے سینوں کو منور کر چکے ہیں۔ الحمد للہ تعالیٰ! اللہ کریم کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

”وفائے ختم نبوت تربیتی نشست“

(محسن علی چشتی)

2 دسمبر 2023ء بروز ہفتہ بعد از نماز عشاء جامعہ رحمت ٹاؤن شپ لاہور ادارۃ المنتہی پاکستان کے کارکنان کی سفیر ختم نبوت حضرت خواجہ غلام دستگیر فاروقی کے ساتھ خصوصی میٹنگ ہوئی جس میں اہم امور پر تبادلہ خیال کیا گیا اور کارکنان نے خصوصی طور پر تحفظ ختم نبوت و ناموس رسالت پر اپنی زندگیاں وقف کرنے کے لیے خواجہ صاحب کو علف دیا۔

جاں نثاران ختم نبوت کے نام درج ذیل ہیں:

☆ قاری اکرام	☆ حبیب الرحمن	☆ محمد نعمان	☆ عامر علی چشتی
☆ محمد احمد	☆ کاشف علی	☆ شرافت علی	☆ قاری اویس
☆ محمد عاصم	☆ محمد قاسم	☆ محمد عبداللہ	☆ محمد مامون
☆ ظہیر احمد	☆ محمد راحیل	☆ قاری مجتبیٰ	☆ محمد محسن
☆ غلام قادر	☆ عامر فاروق	☆ محمد یار رضوی	☆ احسن
☆ غلام مرتضیٰ	☆ تصور حسین	☆ مولانا شریف نوری	☆ عدنان علی
☆ محمد فریاد	☆ محمد عبدالرحمن	☆ عمران سعید	☆ شہباز ڈھکو
☆ دانش علی	☆ محمد احسن شرفی	☆ محمد حسن	☆ محمد احسان
☆ سانول رسول	☆ محمد زین	☆ محمد سمیع الحق	☆ قیصر بلوچ
☆ محمد وقاص عباس	☆ محمد شہزاد	☆ شہزاد عفتور	☆ محمد عمیر رضا
☆ عبدالرحمن	☆ محمد عاطف	☆ محمد شاہد عباس	☆ قالی فلک شیر
☆ حافظ محمد یاسر محمود	☆ قاری عاطف محمود	☆ حافظ عامر امیر	☆ حافظ ابو بکر
☆ مرزل رضا	☆ ماسٹر سعید	☆ محمد جواد احمد	☆ مدثر حسن
☆ قاری غلام شبیر	☆ عبداللہ حمزہ	☆ حافظ قیصر	☆ علی عباس

کرتے ہیں اور ملک بھر کی تمام حُب اسلام قیادت سے اپیل کرتے ہیں 23 فروری جمعۃ المبارک کو بھرپور یوم احتجاج کے طور پر منایا جائے اور عوام و خواص پر واضح کیا جائے کہ منکرین ختم نبوت کو سپورٹ کرنے کی کسی بھی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا۔ آپ کے قریب جو بھی تحریک، فرد واحد تحفظ ختم نبوت کیلئے کوشاں ہے پہلی فرصت میں اس سے جڑ جائیے اور ہر قسمی سیاسی وابستگی کو بالائے طاق رکھ کر اپنے آقا و مولیٰ سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی تقدیس رسالت اور حرمت قرآن کے لئے وقت دے کر نثر خرو ہوں۔

22 فروری 2024ء

نوٹ: ادارہ کے پلیٹ فارم سے ہنگامی بنیادوں پر 25 فروری بروز اتوار ظہر تا عصر پروگرام (جامعہ رحمت ٹاؤن شپ لاہور) ترتیب دیا گیا۔ جس میں خصوصی لیکچر قاطع قادیانیت محمد متین خالد حفظہ اللہ تعالیٰ نے دیا اور فیصلہ پر جرح کر کے سامعین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا یہ ایک گھنٹہ پر مشتمل لیکچر یوٹیوب پر موجود ہے۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ (اعلامیہ)

(احسن سلطانی)

6 فروری 2024ء چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کی سربراہی میں دو رکنی سپریم کورٹ کے بیچ نے جو فیصلہ دیا ہے وہ قرآن و سنت، ملکی قوانین اور آئین پاکستان سے کلی طور پر متصادم ہے۔ چیف جسٹس صاحب کو بجائے اس فیصلہ کے چاہیے کہ وہ قادیانیوں کو مکمل آئین پاکستان ماننے کا حکم دیتے کیوں کہ قادیانی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں جب وہ اپنی حیثیت غیر مسلم اقلیت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو انہیں اقلیتوں والے حقوق کیسے دیے جاسکتے ہیں۔

تحفظ ختم نبوت قانون کو موثر بنانے میں 1883ء سے لے کر تحریک ختم نبوت 1953ء، 1974ء، 1984ء (امتناع قادیانیت آرڈیننس) تک انتھک جدوجہد، لازوال قربانیوں اور شہدا کی ایک انمٹ طویل روشن فہرست ہے۔ بقول اقبال قادیانی اسلام اور وطن کے غدار ہیں۔ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کہا! مزرانی پاکستان کو ختم کرنے میں روز اول سے مصروف ہیں منکرین ختم نبوت کی غلاف اسلام مذموم سرگرمیوں اور سازشوں کو روکنا وقت کا سب سے بڑا جہاد اور تبلیغ ہیں۔ سپریم کورٹ کے جج جسٹس فائز عیسیٰ کا قادیانیت نواز فیصلہ اہل اسلام و پاکستان جذبہ عشق رسول سے معمور غلامان مصطفیٰ کیلئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس قانون کی حفاظت کیلئے قسم بخدا ہماری جانیں حاضر ہیں، فیصلہ واپس لیا جائے نہیں تو دمادم مست قلندر ہوگا۔

ہم نے ہر دور میں تقدیس رسالت کے لیے وقت کی تیز ہواؤں سے بغاوت کی ہے توڑ کر سلسلہ رسم سیاست کا فوں اک فقط نام محمد سے محبت کی ہے آئیں اقبال کا شعر گنگنائیں اور فیصلہ کو یکسر مسترد کریں

وقت عشق سے ہر پشت کو بالا کر دے دہم محمد اسم محمد سے اجالا کر دے
نوٹ: اس سلسلہ میں وطن عزیز کے تمام مکاتب فکر سے اٹھنے والی آوازوں کی ہم مکمل تائید